(حاصلِ مطالعہ)

علامہ اقبال کا سفرِ حیات

اجمالی مطالعہ

مسلمانانِ ہند کو دورِ زوال میں متحرک فکری قیادت مہیا کرنے والے اس صاحبِ علم و عرفان مفکر کی زندگی کا مختصر مطالعہ جس نے قوم کو ماضی کے علوم و تاریخ کے ساتھ رشتہ بحال کر کے بیدار ہونے اور بطورِ ملت سوچنے کا جذبہ دیا

محمد بشیر ہرل

دبستانِ اقبال فیصل آباد

(حاصلِ مطالعہ)

علامہ اقبال کا سفرِ حیات

مسلمانانِ ہند کو دورِ زوال میں متحرک فکری قیادت مہیا کرنے والے اس صاحبِ علم وعرفان مفکر کی زندگی کا مختصر مطالعہ جس نے قوم کو ماضی کے علوم وتاریخ کے ساتھ رشتہ بحال کر کے بیدار ہونے اور بطورِ ملت سوچنے کا جذبہ دیا

محمد بشیر ہرل

دبستانِ اقبال فیصل آباد

نام کتاب	:	علامہ اقبال کا سفرِ حیات
مرتب	:	محمد بشیر ہرل
پہلا ایڈیشن	:	اپریل ۲۰۱۳ء
صفحات	:	۸۱
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
قیمت	:	۱۱۰ روپے
پرنٹر	:	ڈیزائن کلب امین پور بازار فیصل آباد
ناشر	:	دبستانِ اقبال فیصل آباد
		فون نمبر 041-8554460

فہرست عنوانات

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
حرفے چند پروفیسر ڈاکٹر آصف اعوان	۵	تمدنِ اسلام کے احیاء کا ادارہ	۳۳
پیش لفظ	۶	خطباتِ جنوبی ہند	۳۴
بچپن اور ابتدائی تعلیم	۷	ہندو مسلم تعلقات مسلم کش فسادات	۳۷
اعلیٰ تعلیم	۹	ہندو مسلم تعلقات ۔ دو قومی نظریہ	۳۹
علم الاقتصاد	۱۰	تصورِ پاکستان	۴۲
شاعری کی ابتدا	۱۱	خطبہء الٰہ آباد اور قراردادِ پاکستان	۴۴
یورپ کا تعلیمی سفر	۱۶	اسلامی ریاست کے خدوخال	۴۷
پی ۔ ایچ ۔ ڈی	۱۷	اُس دور کی تحریکیں اور مشاہیر	۴۷
بار ایٹ لاء	۱۷	حرکت و حرارت	۵۱
دیگر امتحانات	۱۸	فکرِ اقبال	۵۴
شگفتہ مزاجی	۱۹	آخری ایام	۵۹
ملی سوچ کا آغاز	۲۰	سفرِ آخرت	۶۳
عالمگیر شاعری	۲۳	حیاتِ اقبال ایک نظر میں	۶۵
مطبوعات	۲۸	فلسفہء خودی	۷۰
اس دور کے سیاسی حالات	۲۹	حرفِ آخر	۷۸
پنجاب اسمبلی کی رکنیت	۳۱	صحیح وقت میں بروقت قدم پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود قریشی	۸۰
نظامِ خلافت	۳۲	سلاست، توازن، اختصار پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید	۸۱

حرفِ چند

(اقبالیات کے محقق اور اقبال پر پانچ تحقیقی کتابوں کے مصنف، پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان کے قلم سے)

اقبال ہمارے قومی شاعر اور مفکر ہیں مگر اکثر یہ پریشان کن صورتحال دیکھنے میں آتی ہے کہ ہم میں سے اکثر، حتیٰ کہ سکولوں کے اساتذہ کے پاس بھی اپنے اس قومی ہیرو کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ درست ہے کہ اقبال پر بہت کام ہوا ہے اور اقبال پر لکھی جانے والی کتابوں سے لائبریریوں کی الماریاں بھری پڑی ہیں۔ لیکن ان سے استفادہ صرف چند مخصوص اہلِ علم و فضل تک محدود ہے، اور اقبال کے پیغام اور تعلیمات کی عوام الناس تک رسائی نہیں ہے۔ دورِ حاضر میں زندگی بہت مصروف ہو چکی ہے۔ لوگوں کے پاس پڑھنے اور خاص طور پر سنجیدہ مطالعہ کے لیے وقت نہیں۔ اس صورتحال میں ضرورت ہے کہ ایسے اہم موضوعات پر مبنی مختصر کتابیں لکھی جائیں جنہیں کم سے کم وقت میں پڑھا جا سکے اور ان سے زیادہ سے زیادہ معلومات میسر آسکیں۔ اقبال کے پیغام اور اقبال کی حیات کے متعلق معلومات فراہم کرنے اور انھیں عام کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے۔

جناب بشیر ہرل صاحب کی گراں قدر مختصر کتاب "علامہ اقبال کا سفرِ حیات۔ اجمالی مطالعہ" دیکھی تو میرے اس خیال کو تقویت ملی کہ عوام تک حضرت علامہ کی فکر اور زندگی سے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے ایسی ہی کتابیں کام دے سکتی ہیں جو مختصر اور مفید مطلب ہوں۔ جناب بشیر ہرل صاحب اگرچہ کاروباری آدمی ہیں، تاہم ایک متین، سنجیدہ فکر اور علمی و ادبی ذوق سے آراستہ سلجھی ہوئی طبع کی حامل شخصیت ہیں۔ اور خاص طور پر اقبالیات کے حوالے سے ہرل صاحب کا ذوق قابلِ تحسین ہی نہیں قابلِ تقلید بھی ہے۔ آپ کی اس مختصر کتاب میں حیاتِ اقبال کے حوالے سے تمام ضروری معلومات یکجا کر دی گئی ہیں، اور پیدائش، بچپن، والدین، ابتدائی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، اساتذہ، قیامِ یورپ کا زمانہ، شاعری، تصانیف، سیاست، ملّی فکر و جذبہ، آخری ایام اور وفات، غرضیکہ حیاتِ اقبال کے کم و بیش ہر حوالے سے معلومات سمو دی گئی ہیں۔ قاری یقیناً بشیر ہرل صاحب کی اس گرانقدر خدمت کا سپاس گزار ہوگا۔

ڈاکٹر محمد آصف اعوان

شعبہء اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

پیش لفظ

میری اس تحریر کا مقصد علمی ذخیرہ میں اضافہ نہیں بلکہ عوام الناس کے لیے علامہ اقبال کا تعارف پیش کرنا مقصود ہے۔ حکیم الامت شاعرِ مشرق علامہ سر محمد اقبال، بار ایٹ لاء، پی ایچ ڈی کی ذات، کلام اور فکر کے بارے میں اس قدر علمی کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے کہ شائد ہی کسی قومی شاعر یا مفکر کے بارے میں ہوا ہو۔ ان علمی نگارشات میں ۱۹۷۷ء اور اس کے بعد زیادہ تیزی آئی جب ہندوستان نے اور پھر پاکستان نے علامہ کا صد سالہ جشن منانے کا اعلان کیا۔ مجھے یہ سارا لٹریچر پڑھنے کا دعویٰ نہیں، تاہم کسی قدر سنجیدگی سے علامہ کے بارے میں مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ امید ہے کہ میری یہ مختصر کوشش شاعرِ مشرق کی شخصیت کا تعارف ثابت ہو سکے گی۔

ماہرِ اقبالیات پروفیسر ڈاکٹر آصف اعوان صاحب نے جس عرق ریزی سے زبان و بیان اور متن کا جائزہ لے کر مسودہ کی اصلاح فرمائی اس کے لیے میں سراپا سپاس ہوں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود قریشی صاحب نے اس کوشش کو پسند فرمایا اور صحیح وقت میں بر وقت اقدام کہہ کر عزت افزائی فرمائی۔ پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید صاحب نے بکمال عنایت اپنے تبصرہ میں اس کوشش کو مفید خدمت قرار دیا جو میرے لیے اعزاز ہے۔

میں صاحبِ علم برادرِ عزیز شبیر ہرل صاحب کا اور صاحبِ مطالعہ دوست چوہدری محمد اسماعیل صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے ابتدائی مسودہ میں گرانقدر اور اہم تجاویز سے مدد فرمائی۔ فارسی اشعار کے ساتھ اردو ترجمہ اپنی ہمدمِ دیرینہ بیگم انور سلطانہ کی تجویز پر شامل کر رہا ہوں۔ اگرچہ ترجمہ میں اصل شعر کا حسن باقی نہیں رہتا تاہم اس طرح مفہوم سمجھنے میں ضرور مدد ملے گی۔

محمد بشیر ہرل۔ ۲۱ اپریل ۲۰۱۳ء

'علامہ اقبال کا سفرِ حیات'

بچپن اور ابتدائی تعلیم

اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم سیالکوٹ ہی میں حاصل کی۔ گھرانا دیندار تھا۔ والد نے علامہ کو بچپن ہی سے تلاوت، نماز، حسنِ اخلاق، بڑے چھوٹے کے آداب سکھائے اور صبح کی تلاوت کی عادت ڈالی۔ پانچ سال کی عمر میں مسجد میں بٹھایا پھر سید میر حسن کے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے اپنے ہونہار شاگرد کو پوری توجہ سے عربی اور فارسی کی تعلیم دینے کا خصوصی اہتمام کیا۔ اس سے علامہ کو قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کی صلاحیت ملی اور آپ کی سیرت کی تعمیر میں قرآن پاک بنیادی محرک کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اسی نے انکی سوچ کو عام شاعروں کی سطح سے بلند کیا ۔ جب سید میر حسن کو سکاچ مشن ہائی سکول میں ملازمت مل گئی تو اقبال کو بھی ۷ سال کی عمر میں سکاچ مشن سکول میں پہلی جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ مڈل کا امتحان ۱۴ سال کی عمر میں پاس کر لیا۔ سکول کے بعد اقبال سید میر حسن کے گھر پر بھی پڑھتے ۔ سید میر حسن سرسید سے متاثر تھے اور ملاقات بھی تھی۔ اقبال بھی ان کی وساطت سے ہی سر سید اور علی گڑھ تحریک سے واقف اور متاثر ہوئے ۔ حتیٰ کہ بعد میں جب سر سید کے پوتے سر راس مسعود سے ملاقات ہوئی تو گہری دوستی ہو گئی۔ علامہ اقبال کے مزاج پر شاہ صاحب کا گہرا اثر پڑا۔ آپ کی طبیعت میں سادگی قناعت، استغناء، ظرافت اور بذلہ سنجی بالکل اپنے استاد سید میر حسن کی طرح تھی۔ انگلستان جانے لگے تو دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار پر اپنی نظم التجائے مسافر پڑھی۔ اس نظم میں سید میر حسن کے متعلق یہ

شعر بھی شامل تھے

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم، جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کِھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو

۱۹۲۳ء میں جب آپ کو سر کا خطاب دیا گیا تو آپ نے اپنے استاد کے لئے بھی خطاب کی شرط عائد کر دی اور سید میر حسن بھی شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ سید میر حسن کی وفات پر اقبال نے مادہ ءِ وفات نکالا "ما ارسلنک الّا رحمۃ للعٰلمین"۔ استاد اور شاگرد کا یہ تعلق آجکل معدوم ہوتا جا رہا ہے۔

اعلیٰ تعلیم

اقبال نے ۱۸۹۱ء میں مڈل اور ۱۸۹۳ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا اور تمغہ اور وظیفہ حاصل کیا۔ جس دن میٹرک کا نتیجہ آیا اس دن اقبال کی پہلی شادی خود سے تین سال بڑی لڑکی سے ہوگئی۔ (بعد میں بوجوہ دو اور شادیاں بھی ہوئیں)۔ اس کے بعد آپ انٹرمیڈیٹ کی کلاس میں بیٹھ گئے جو کہ سکول میں ہی شروع ہو چکی تھیں۔ ۱۸۹۵ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے میں داخلہ لے کر ہوسٹل میں مقیم ہوئے۔ ۱۸۹۷ء میں بی اے کیا، عربی اور انگریزی میں امتیازی حیثیت اور تمغے حاصل کیے اور فلسفے کی طرف طبعی رجحان کی وجہ سے ایم اے فلسفہ میں داخلہ لے لیا۔ ۱۸۹۸ء میں پروفیسر آرنلڈ علی گڑھ چھوڑ کر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوگئے تھے۔ وہ سرسید کے پسندیدہ معلم اور مولینا شبلی نعمانی کے گہرے دوست تھے۔ اقبال کی صلاحیتوں کی بنا پر وہ اقبال سے دوستانہ برتاؤ کرنے لگے اور ان کی مشفقانہ رہبری نے اقبال کے فلسفہ کی تحصیل کے ذوق کو خوب جلا بخشی۔ مارچ ۱۸۹۹ء میں اقبال نے ایم اے فلسفہ میں کامیابی حاصل کی اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ پروفیسر آرنلڈ کیساتھ بھی اقبال کا سید میر حسن جیسا تعلق قائم ہوگیا، اور جب وہ ۱۹۰۴ء میں واپس انگلینڈ چلے گئے تو اقبال نے ایک الوداعی نظم "نالۂ فراق" تحریر کی جس میں یہ شعر بھی تھے

تو کہاں ہے، اے کلیمِ ذرۂ سینائے علم!
تھی تری موجِ نفس، بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائیِ صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

اقبال ۱۸۹۹ء میں ۲۲ برس کی عمر میں ایم اے فلسفہ کرنے کے بعد چار سال تک اورینٹل کالج میں عربی ٹیچر رہے۔ اس دوران میں چھ ماہ کی رخصت لے کر گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ۱۹۰۱ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہو گئے تاہم دائیں آنکھ کی بینائی کی بے حد کمزوری کے باعث میڈیکل بورڈ نے اَن فٹ قرار دے دیا۔ (بچپن میں جونکیں لگوانے کی وجہ سے اقبال کی دائیں آنکھ کی بینائی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی)۔

علم الاقتصاد:

اسلامیہ کالج کے اسی دور میں اقبال نے اپنی پہلی تصنیف "علم الاقتصاد" مرتب کی جس کے دیباچہ میں معاشی سرگرمی اور انسانی نفسیات میں تعلق پر بات کرتے ہوئے سوال اٹھاتے ہیں کہ 'جو انسان اپنے پیٹ کی بھوک نہ مٹا سکتا ہو، اس کی ذہنی کیفیت کیا ہو جاتی ہوگی؟'۔ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ غربت کا روح پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے، روح کا آئینہ دھندلا جاتا ہے اور انسان معاشرتی اور اخلاقی حیثیت کھو دیتا ہے۔ یہ دردمندانہ سوال بھی اٹھایا کہ 'سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں آبادی کے اتنے کثیر حصے کی فلاکت اتنا لازمی عنصر کیوں ہے'؟' کیا یہ ممکن نہیں کہ گلی کوچوں میں بلند ہوتی غربت وافلاس کی چیخیں خاموش ہو سکیں'؟' کیا بھوک اور محرومی کے روح فرسا مناظر کرہ ارض سے مٹائے نہیں جا سکتے؟ ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی پسماندگی کی وجہ ہندو مہاجن اور سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کو سمجھتے تھے۔ یہ سوالات اقبال کے ذہن میں مسلسل کلبلاتے رہے حتیٰ کہ ۱۹۳۰ میں اپنے خطبہ الٰہ آباد میں آپ نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا تصور دیا تو اس کا ایک بڑا محرک مسلمانوں کے لیے معاشی خود مختاری کا حصول بھی تھا۔

شاعری کی ابتدا

اقبال کی طبیعت میں بچپن کی تعلیم وتربیت نے علم وادب سے قدرتی مناسبت پیدا کر دی تھی، پھر مولوی میر حسن سے فارسی اور عربی زبانوں پر عبور کے حصول کے دوران میں تاریخ واخلاقیات سے شناسائی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، چنانچہ سکول کے زمانہ ہی میں کلام موزوں ہونے لگا اور کبھی کبھی سیالکوٹ کے مقامی مشاعروں میں اپنا کلام سنانے لگے۔ بعد میں ایک مختصر عرصے تک آپ اپنے کلام کی اصلاح بذریعہ ڈاک اُس وقت کے مشہور ومعروف شاعر، اور نظامِ دکن کے استاد داغ دہلوی سے بھی لیتے رہے۔ نومبر ۱۸۹۳ء میں جب اقبال فرسٹ ائیر میں تھے تو چند غزلیں دہلی کے رسالہ "زبان" میں شائع ہوئیں جن میں انھیں حضرتِ داغ دہلوی کا شاگرد لکھا گیا۔ دسمبر ۱۸۹۶ کی ایک غزل کا مقطع ہے

جنابِ داغ کی اقبال، یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخن داں بھی، سخنور بھی

اگرچہ اقبال، داغ کی شاگردی کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تاہم داغ نے جلد ہی سمجھ لیا اور علامہ کو بتا دیا کہ اُن کے کلام میں اِصلاح کی گنجائش نہیں۔ علامہ کو مولانا حالی، اور مولانا شبلی کے علاوہ اکبر الٰہ آبادی جیسے بلند پایہ شعراء کی رہنمائی بھی میسر رہی۔ مرزا غالب کی قدرتِ کلام اور ندرتِ خیال کے معترف تھے۔ لکھتے ہیں

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

اقبال دلکش شخصیت کے مالک تھے۔لڑکپن کی حدود سے نکل کر شباب کی سرحدوں میں داخل ہوتے ہوئے شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس نکھری رنگت اور بھرے بدن کے اس بانکے نوجوان کے باوقار چہرے کو دیکھتے ہی ان کی غیر معمولی شخصیت کا نقش دلوں پر ثبت ہو جاتا۔انہوں نے ۱۸ برس کی عمر میں ۱۸۹۵ء میں پہلی بار لاہور کے مشاعرہ میں ایک نظم پڑھی۔اس بزم میں ان کو ان کے چند ہم جماعت کھینچ کر لے آئے تھے اور انہوں نے ہی کہہ سن کر ایک غزل پڑھوائی تو اس کا یہ شعر سب کی توجہ کا مرکز بن گیا

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے،عرقِ انفعال کے

یہی وہ شعر تھا جسے سنتے ہی اس زمانے کے اردو کے معروف شاعر میرزا ارشد گورگانی اچھل پڑے اور کہنے لگے کہ "اقبال، اس عمر میں یہ شعر ! " اس مشاعرہ سے پہلے لاہور میں لوگ اقبال سے واقف نہ تھے۔اس نظم کی چھوٹی بحر کی شوخی اور بے ساختہ پن کو بہت زیادہ پذیرائی ملی۔یوں ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء میں اقبال کا بطور شاعر تعارف ہوا۔بعد میں اس تعارف کی بنیاد پر انجمن حمایت اسلام کے بڑے مجمعوں اور جلسوں میں " کبھی اے نوجواں مسلم، تدبّر بھی کیا تو نے " جیسی نظمیں پڑھ کر ملی اور عوامی شاعر کی حیثیت سے مقبولِ عام ہوئے اور اردو شاعری میں بتدریج نام پیدا کیا۔آپ کی اس دور کی شاعری میں ہندی قومیت کا جذبہ نمایاں تھا۔مشاعروں کے علاوہ انجمن حمائت اسلام کے سالانہ اجتماع آپ کی شہرت کا باعث بنے۔یہاں سے گویا اقبال کی اردو شاعری کی شہرت شروع ہوئی، اور مختلف رسالے، اخبار، انجمنیں اور مجالس درخواستیں کرنے لگے کہ اُن کے سالانہ جلسوں میں وہ لوگوں کو اپنے کلام سے محظوظ کریں۔اسی

دوران وہ فارغ التحصیل ہو کر، اسلامیہ کالج میں لیکچرر مقرر ہو چکے تھے۔ چنانچہ اپنے دن رات علمی صحبتوں میں بسر کرنے لگے۔ طبیعت زوروں پر تھی، ایک ایک نشست میں بے شمار شعر کہہ دیتے، اور غضب کے شعر کہنے لگے۔ علامہ اپنی دُھن میں کہتے چلے جاتے اور جو دوست پاس بیٹھے ہوتے پنسلیں لے کر لکھتے جاتے۔ (ذرا اُس دور کے علم پسند ماحول کا اندازہ لگائیے)۔ جب کلام موزوں ہونے لگتا تو اُن پر رقّت اور وجد کی ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی۔ اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود جھومتے تھے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔ علامہ سے پہلے مشاعروں میں لوگ تحت اللفظ پڑھتے تھے لیکن علامہ کی آواز قدرتاً بلند اور خوش آئند تھی۔ طرزِ ترنم خوب تھا۔ آپ نظم ترنم سے پڑھتے تو ایسا سماں بندھتا کہ سکوت کا عالم طاری ہو جاتا۔ ترنم کی وجہ سے عام لوگ بھی آپ کا کلام سننے اور سمجھنے لگے۔ لاہور میں انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں علامہ نظم پڑھتے تو دس دس ہزار آدمی ایک وقت میں جمع ہو جاتے اور جب تک علامہ نظم پڑھتے رہتے، عوام محو رہتے۔ آپ کی ابتدائی دور کی شاعری میں بھی ایسا تدبر، تجسس، تفکر اور پیغام ملتا ہے کہ سوچ سر دھنتی ہے۔ جستجو بچپن ہی سے آپ کے مزاج کا حصہ تھی۔ عہدِ طفلی نامی اپنی نظم میں لکھتے ہیں

تکتے رہنا ہائے! وہ پہروں تلک سُوئے قمر
وہ پھٹے بادل میں بے آوازِ پا اُس کا سفر
آنکھ وقفِ دید تھی، لب مائلِ گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

اسی طرح اپنی ابتدائی دور کی نظم گلِ رنگیں میں پھول کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں

مطمئن ہے تو، پریشاں مثلِ بُو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

ابتدائی دور میں ہی آپ مظاہرِ فطرت اور کائنات کے مشاہدہ سے سبق سیکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ آپ نے تصورِ عشق کے معنی بدل دیے اور سیماب پائی، آگے بڑھتے جانے، مسلسل بے قراری، جھپٹنے پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے کے جذبہ کو جذبۂ عشق قرار دیا۔ اور عشق کو عقل پر واضح فوقیت دی جیسا کہ ان اشعار میں ظاہر ہے

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

خرد زنجیر بودے آدمی را
اگر در سینۂ او دِل نبودے

(اگر انسان کے سینے میں دل نہ ہوتا تو یہ عقل تو پیروں کی زنجیر بن جاتی)

حیدر آباد کے ایک انگریزی خطبہ میں آپ نے کہا کہ عشق عقل کی ایک برتر کیفیت کا نام ہے "Love is a higher form of intellect" حب الوطنی، انتشار سے گریز اور اتفاق کی تعلیم کے علاوہ زندگی اور موت کے فلسفہ جیسے سنجیدہ مظامین بھی اس دور کی شاعری میں بیان ہوئے ہیں۔ نظم کنارِ راوی کے آخری شعر ہیں

جہازِ زندگیٔ آدمی، رواں ہے یونہیں
ابد کے بحر میں پیدا یونہیں، نہاں ہے یونہیں

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے، لیکن فنا نہیں ہوتا

سالوں بعد، انگریزی خطبات میں آپ نے یہی بات اس طرح کہی: 'Man can not come to an end by dissolution of body' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے خیالات نوجوانی میں بھی کس بلندی پر تھے۔

یورپ کا تعلیمی سفر

آپ کو قدرتی طور پر علمِ فلسفہ کی تحصیل کا شوق تھا۔ اسی شوق کی وجہ سے انہیں کالج میں غیر معمولی قابلیت کے حامل استاد، سر تھامس آرنلڈ کی خصوصی توجہ میسر آ گئی تھی جن کی اپنی قوتِ تحریر بہت اچھی تھی۔ انہوں نے اپنے شاگردِ خاص کو علمی جستجو کے طریقِ جدید سے آشنا کیا۔ جب ۱۹۰۴ء میں آپ کے دوست شیخ عبدالقادر یورپ جانے لگے تو آپ نے بھی ارادہ کر لیا۔ کچھ بچت اپنے پاس تھی اور کچھ رقم بڑے بھائی نے مہیا کی اور اقبال ۱۹۰۵ء میں فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کرنے اور بیرسٹری کرنے کے لئے یورپ روانہ ہو گئے۔ اقبال نسلاً کشمیری پنڈت تھے، ہمیشہ قومی لباس پہنتے بلکہ گھر میں عموماً تہبند اور بنیان پہنتے تھے۔ سردی ہوتی تو قمیص پہن کر اوپر دھسّہ اوڑھ لیتے۔ باہر جانے کے لئے کوٹ یا اچکن پہن لیتے، پاؤں میں پمپی یا دیسی جوتا اور سر پر رومی ٹوپی یا کالی قراقلی کی اونچی ٹوپی پہنتے۔ بعض اوقات سر پر لنگی بھی باندھ لیتے تھے۔ لیکن یورپ میں پہننے کے لئے انہوں نے خاص طور پر انگریزی سوٹ سلوائے اور قیامِ یورپ کے دوران فیلٹ ہیٹ بھی استعمال کرتے رہے۔ یورپ روانگی کے وقت دہلی میں نظام الدین اولیا کے مزار پر اپنی نظم التجائے مسافر پڑھی اور پھر مرزا غالب کی مرقد پر کھڑے ہو کر قوال سے غالب کی یہ غزل سنتے رہے

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں

بارے اب اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی

غزل ختم ہونے پر عجیب محویت کے عالم میں تربت کو بوسہ دے کر روانہ ہو گئے۔

پی ایچ ڈی:

انگلینڈ پہنچ کر کیمبرج میں رہائش اختیار کی اور اپنے موضوعِ تحقیق کے متعلق میونخ یونیورسٹی میں رجسٹریشن کروادی۔ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے لیے بہت بڑی تعداد میں فارسی کتب کا مطالعہ کیا اور فلسفہء ایران کی تاریخ پر اپنا تحقیقی مقالہ "ایران میں فلسفہء مابعد الطبیعات کا ارتقا" کے عنوان سے تحریر کیا۔ میونخ یونیورسٹی میں آپ کا زبانی امتحان ۴ نومبر ۱۹۰۷ء کو ہوا، اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل ہوئی۔ یہ مقالہ ۱۹۰۸ء میں لندن سے شائع ہوا اور پروفیسر آرنلڈ کے نام سے منسوب کیا گیا۔ (کئی سال بعد ۱۹۲۶ء میں اس مقالہ کے بارے میں علامہ نے یہ تبصرہ کیا: " یہ کتاب اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس وقت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آچکا ہے۔ میرے خیال میں اب اس کتاب کا صرف تھوڑا سا حصہ ہی باقی ہے جو تنقید کی زد سے بچ سکے "۔

بارایٹ لاء:

اسی دوران میں آپ نے کیمبرج کے ٹرینٹی کالج میں ریسرچ سکالر کی حیثیت سے داخلہ لے لیا تھا اور ساتھ ہی ٦ نومبر ۱۹۰۵ء کو بیرسٹری کے لئے لِنکنز اِن میں داخلہ لے لیا تھا۔ یکم جولائی ۱۹۰۸ء کو آپ کو بارایٹ لاء کی ڈگری مل گئی اور آپ وطن واپس آ گئے

دیگر مطالعہ اور امتحانات:

اگر چہ آپ کا داخلہ ریسرچ سکالر کی حیثیت سے ہوا تھا اور روائتی ٹرائی پوس کے امتحان کی ضرورت نہ تھی، تاہم اپنی دلچسپی سے اقبال نے یونیورسٹی سے اجازت لے کر یورپی فلسفہ کے مطالعہ کے لئے کیمبرج میں لیکچروں میں شمولیت اختیار کی اور جون ۱۹۰۷ء میں کیمبرج سے بھی فلسفے اور اخلاقیات کے شعبے میں بی۔اے کی اضافی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ معاشیات میں خصوصی دلچسپی کی وجہ سے وہ کیمبرج میں اس موضوع پر لیکچر بھی بہت اہتمام سے سنتے رہے، اور کانت اور ہیگل کے فلسفے پر، پروفیسر میک ٹیگرٹ کے لیکچر بھی سنتے رہے۔ یہاں ہی پروفیسر براؤن اور نکلسن سے بھی تعلق قائم ہوا اور بعد میں پروفیسر نکلسن نے آپ کی مشہور فارسی نظم "اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ کر کے اور اس پر حواشی لکھ کر یورپ اور امریکہ کو اقبال سے رُوشناس کرایا۔

شگفتہ مزاجی

علامہ جوانی میں بھی اکثر سوچ میں گم ہو جایا کرتے اور قیامِ یورپ میں بھی یہی معمول رہا لیکن اس کے باوجود آپ مزاجاً نہایت خوشگوار اور بذلہ سنج تھے۔ بیگم عطیہ فیضی اسی دور میں یورپ میں زیرِ تعلیم تھیں اور علامہ کے ساتھ ان کی گہری علمی اور فکری دوستی تھی۔ ان کے بقول ڈاکٹر اقبال خوش مزاج اور حاضر جواب تھے۔ برجستہ مزاحیہ فقرے کسنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ دوستوں کی محفلوں میں رات رات بھر عالمانہ اور ظریفانہ باتیں ہوتی رہتیں، بعض اوقات اقبال تھکے تھکے اور خاموش بھی نظر آتے لیکن جونہی کسی نے کچھ کہا وہ بجلی ایسی سرعت سے اس پر کوئی نہ کوئی فقرہ ایسا کستے کہ لاجواب کر دیتے۔ اقبال کی رگِ ظرافت پھڑکنے سے باز نہیں رہتی تھی۔ ایک شب ہوسٹل میں رات کے کھانے پر کسی لڑکی کو دیکھ کر عطیہ فیضی کے سامنے یہ شعر فی البدیہہ موزوں کر کے انہیں خوب ہنسایا

اُس کے عارض پر سنہری بال ہیں

ہو طلائی استرا اس کے لیے

دوستوں کی محفل میں فی البدیہہ مزاحیہ اشعار سنا کر محفل کو زعفران زار بنا دیتے۔ لیکن ایسے اشعار کے نوٹ کرنے سے یہ کہہ کر روک دیتے کہ یہ مخصوص موقع سے متعلق تھے۔ زندہ دلی کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں طنز کا پہلو نمایاں تھا اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ چوہدری شہاب الدین بہت پائے کے وکیل تھے لیکن ان کا رنگ بے حد کالا تھا۔ ایک دن وہ مکمل کالا سوٹ زیبِ تن کر کے بار روم میں تشریف لائے تو علامہ سے رہا نہ گیا اور بولے "چوہدری صاحب! آج تو آپ ننگے ہی تشریف لے آئے"۔

ملی سوچ کا آغاز

قیامِ لندن کے دوران میں اقبال نے اسلامی دین وتمدن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا جس کے موضوعات تھے: اسلامی تصوف، تہذیبِ یورپ پر مسلمانوں کا اثر، اسلامی جمہوریت، اسلام اور عقلِ انسانی وغیرہ۔ لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے چھ مہینے تک عربی زبان کے پروفیسر بھی رہے۔ یورپ کے قیام کے زمانے میں ان کے اساتذہ نے ان کے ساتھ بہت قریبی تعلق رکھا اور علوم کو ان کے سینے میں اتار دیا۔ یہاں علامہ کو تہذیبوں کے تقابلی مطالعہ اور یورپی فلسفیوں کے خیالات سمجھنے کا موقع ملا۔ اس سے ان کے اپنے خیالات میں بہت واضح تبدیلی آئی۔ اس دور میں فکرِ اقبال میں جو سب سے بڑا انقلاب آیا وہ ان کا وطنی قومیت اور مروجہ فلسفہء تصوف سے بیزار ہو کر ذہنی اور قلبی طور پر اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا تھا۔ ۱۹۲۱ء کے اپنے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب وہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلمبند کروں گا"۔ آپ کا ایک شعر ہے

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

علامہ اقبال کی وفات پر شائع کیے جانے والے اپنے ایک تعزیتی مضمون میں ان کے متعلق مولینا سید ابو الاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ تا ۱۹۷۹ء) نے یہ الفاظ استعمال کیے:

"اس شخص کا حال کیا تھا؟ مغربی تعلیم وتہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا

مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی ہی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا۔ جو دیکھتا تھا، قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شئے واحد تھے، اور اس شئے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس دور کے علمائے دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی القرآن میں اس امامِ فلسفہ اور اس ایم اے، پی ایچ ڈی، بار ایٹ لاء سے لگّا کھاتا ہو"۔

وطن واپسی تک آپ کی عمر ۳۱ برس ہو چکی تھی۔ آپ کو سنسکرت، اردو، فارسی، عربی ادب، انگریزی ادب اور یورپ کی کئی زبانوں میں مہارت حاصل ہو چکی تھی اور علوم القران، تاریخ، جغرافیہ، مختلف تہذیبوں اور قانون جیسے موضوعات پر مسلم، یورپی، عیسائی اور یہودی علماء کا عمیق مطالعہ کر چکے تھے۔ انگریزی ادب سے شناسائی کے سبب اقبال شیکسپیئر کے علاوہ ملٹن، وڈزورتھ، شیلے، بائرن، براؤننگ، میتھیو آرنلڈ، ٹینی سن، ایمرسن، گرے، لانگ فیلو وغیرہ سے متاثر تھے اور بعض کی نظموں کو اردو میں بھی ڈھالا۔ فرانسیسی ادب بھی ان کی نظر سے گزرا تھا۔ جرمنی میں قیام کے دوران جرمن زبان بھی سیکھ لی تھی۔ اقبال جرمن شعرا کے کلام سے بحیثیت مجموعی بہت متاثر تھے مگر گوئٹے کا اثر ان پر بہت گہرا اور دیرپا تھا۔ قیامِ یورپ کے دوران ہی میں آپ کو مغربی تہذیب کے زوال کا ادراک ہوا۔ جب انہوں نے قریب سے دیکھا تو اس کی خرابیاں ان پر عیاں

ہوئیں اور انھوں نے مغربی تہذیب کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا، جیسے تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔ ۱۹۰۷ء میں اقبال کے قلبی اور ذہنی انقلاب کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ انہوں نے برصغیر میں متحدہ قومیت یا ہندو مسلم اتحاد کے خیال سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ان کی جولائی ۱۹۰۸ء کی ایک تحریر میں یہ الفاظ شامل ہیں: "اب میں سوچتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنا اپنا قومی تشخص ایک دوسرے سے الگ برقرار رکھیں۔ مشترک قومیت کا تصور شاعرانہ کشش کے باوجود موجودہ حالات اور دونوں قوموں کے نادانستہ رجحانات کے پیشِ نظر ناقابلِ عمل ہے"۔ یہ تصور اس سے پہلے سر سید احمد خان بھی پیش کر چکے تھے۔ اور بعد میں ۱۹۲۴ء میں ہندوؤں کے معتبر لیڈر لالہ لاجپت رائے نے بھی اس خیال کا اظہار کیا کہ " ہندو مسلم آبادی کے لحاظ سے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کر دی جائے اور پھر مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان، اور مشرقی بنگال کے علاقے مسلمانوں کو دے دیے جائیں، اور ہند کے باقی تمام صوبوں میں ہندو حکومتیں قائم ہو جائیں" مگر بعد میں ہندوؤں کے دباؤ پر مکر گئے۔ ۱۹۲۴ء ہی میں روسی مردِ آہن سٹالن نے بھی کہا تھا کہ *ہندوستان بظاہر ایک ملک نظر آتا ہے لیکن جب وہاں انقلاب آیا تو کئی اجنبی قومیں منصۂ شہود پر آ جائیں گی"۔ علامہ اقبال سولہ برس پہلے ہی اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے۔

عالمگیر شاعری

علامہ کی اصل وجہِ شہرت ان کی وہ عالمگیر شاعری ہے جس کا بے نظیر تخیل اور نرالا اندازِ بیان صدیوں تک دلوں کو گرماتا رہے گا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا عرصہ آپ نے یورپ میں گزارا۔ اِس دوران میں آپ نے بہت کم نظمیں لکھیں لیکن خوب لکھیں۔ مثلاً نظم سلیمیٰ آپ کے شعری کمال اور مزاج کا ایک اعلیٰ مظہر ہے:

جس کی نمود دیکھی، چشمِ ستارہ بیں نے
خورشید میں، قمر میں، تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدہ میں پایا
شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
جس کی چمک ہے پیدا، جس کی مہک ہویدا
شبنم کے موتیوں میں، پھولوں کے پیرہن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر
ہنگامہ جس کے دم سے کاشانۂ چمن میں
ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اُس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ! تیری کمال اُس کا

(سلیمیٰ نام کی کسی خاتون کا علامہ کی زندگی میں وجود نہیں تھا۔ یہ شاعرانہ کمال کی ایک بہترین مثال ہے، اور ساتھ ہی اِس بات کی کہ حسنِ فطرت، حسنِ شکل یا حسنِ مظاہر کو دیکھ کر آپ کا دماغ کدھر مائل ہوتا تھا)

قیامِ یورپ کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے ارادہ کرلیا کہ شاعری بالکل ترک کردیں گے اور اپنا وقت کسی مفید کام میں صرف کریں گے لیکن اُن کے دوست شیخ عبدالقادر بار ایٹ لاء، اور آپ کے محبوب استاد سَر آرنلڈ نے اصرار کیا کہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ہندوستان کی درماندہ مسلم قوم کے امراض کا علاج ممکن ہے۔ چنانچہ یہ جو تغیرّ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں آیا تھا اُس کا خاتمہ ہوا، لیکن اِس دوران ایک دوسرا تغیّر پیدا ہوگیا اور آپ نے اپنے کلام کے لئے اردو کی بجائے فارسی زبان کو ذریعہء اظہار بنالیا۔ یورپ میں قیام کے دوران میں آپ نے فارسی علوم وادب کا عمیق مطالعہ کیا تھا اور سید جمال الدین افغانی اور مولینا روم کے افکار آپ کے قلب وذہن پر چھا گئے تھے۔ چنانچہ یورپ سے واپسی پر اگرچہ کبھی کبھی اردو کی بہت معرکے کی نظمیں بھی کہیں مگر طبیعت کا رُخ فارسی کی طرف ہو چکا تھا جس میں اُن دقیق خیالات کا اظہار ممکن ہوا جو روز افزوں تحقیقی مطالعہ کے نتیجہ میں آپ کے قلب وذہن میں پیدا ہورہے تھے اور اسی دور میں یعنی ۱۹۰۸ء کے بعد مثنوی اسرارِ خودی فارسی میں تخلیق کی جس نے آپ کی شہرت ہندوستان سے باہر بھی پورے عالمِ اسلام میں پہنچا دی۔ ان کی طویل مثنویوں اسرار خودی (۱۹۱۵) اور رموزِ بے خودی (۱۹۱۸ء) میں ڈاکٹر صاحب کے ملی خیالات کا بھرپور اظہار پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں طویل مثنویاں فارسی میں لکھی گئی ہیں کیونکہ وہ اپنا پیغام ہندوستان کے پڑھے لکھے طبقات کے علاوہ بیرونِ ہند ملتِ اسلامیہ کو بھی پہنچانا چاہتے تھے بالخصوص افغانستان اور ایران میں۔ علامہ اقبال کا فارسی کلام زیادہ فصیح ہے۔ ان کے دل میں اسلام اور ملت کے لئے جو درد، اِضطراب اور بے چینی تھی اس کی صحیح عکاسی ان کے فارسی کلام میں ہے۔ یورپ سے واپسی کے بعد اپنے وسیع

علمی پس منظر کے ساتھ جب آپ نے ہندوستانی مسلمانوں کے حالات پر غور شروع کیا تو اُس بے علم اور بے عمل خانقاہی زندگی سے سخت بیزار ہو گئے جسے عرفِ عام میں غلط طور پر تصوف کا نام دے دیا گیا تھا اسی نے مسلمان قوم کو کمزور کیا تھا اور ہندوستان میں انکے سیاسی زوال کا باعث بنا تھا

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک

نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ!

مثنوی اسرارِ خودی میں آپ نے اسی بے عملی کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہیں ملت کی زبو ں حالی اور قرآن سے مسلمانوں کی دوری کا بہت قلق تھا۔ یہی وہ دور تھا جب انہوں نے ملت کے تصور پر مبنی نظم "ترانہءملّی" رقم کی اور "مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کا نعرہ بلند کیا۔ ان کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی عظمتِ رفتہ دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اسلامی امت کے طور پر جدوجہد کرنی چاہیے۔ وہ فلسفی بار ایٹ لاء مغربی فلسفہ اور تہذیب وتمدن کے شناور ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخِ ہند، تاریخِ اسلام، اور ملتِ اسلامیہ کے عروج وزوال سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ملت کی موجودہ حالت دیکھ کر کڑھتے تھے اور اس کے ذہنی و عملی انحطاط کو دور کرنے کے لئے بے قرار تھے۔ مسلم تہذیب کے زوال کی وجوہات کا تجزیہ ان کا محور تھا۔ قوم کی بے مائیگی، بے بسی، اپنے وجود سے بے خبری اور اپنے تہذیبی اور اخلاقی سرمائے کی بے قدری اپنے کلام میں بہت دردمندانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

تمام عارف وعامی خودی سے بیگانہ

کوئی بتائے یہ مسجد ہے یا کہ میخانہ

فکری شاعری شروع کرتے ہی علامہ کو اپنے کلام کے ردِ عمل میں سنگ پاشی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ "شکوہ" جیسی عدیم النظیر نظم پر وہ شور اٹھا کہ آپ کو "جواب شکوہ" لکھنا پڑا۔ اسی طرح مثنوی اسرار خودی کی اشاعت کے بعد افلاطون اور حافظ شیرازی کے کچھ "پرستاروں" نے ایسا غل مچایا کہ علامہ کو شغال، خر، دشمنِ اسلام، رہزنِ اسلام، بندۂ دنیا، دین فروش، ملت فروش اور آئین فروش تک قرار دے دیا۔ لیکن علامہ نے انا کا مسئلہ بنانے کی بجائے اس مثنوی کے دوسرے ایڈیشن میں خواجہ حافظ کے متعلق وہ اشعار ہی حذف کر دیئے اور نئے، قابلِ قبول اشعار لکھ دیئے۔ آپ نے یہ مشکل لیکن دانشمندانہ فیصلہ بالکل درست کیا۔ مباحث میں پڑنے کی بجائے اپنے پیغام پر توجہ مرکوز رکھی۔ در اصل علامہ ایک فلسفی اور بلند پایہ مفکر تھے جو اپنے اندر تخیلات اور فلسفہ کے ابلتے ہوئے لاوے کو سپردِ قلم کرتے رہے جیسے

مکانی ہوں، کہ آزادِ مکاں ہوں
جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں؟
وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست
مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں؟

یا

من کیم، تو کیستی، عالم کجاست؟
درمیانِ ما و تو، دوری چراست؟
من چرا در بندِ تقدیرم بگوے
تو نمیری، من چرا میرم بگوے

میں کون ہوں، تو کون ہے، دنیا کہاں ہے؟ ہمارے اور تمہارے درمیان دوری آخر کیوں ہے؟
مجھے بتا تو سہی میں تقدیر کی پابندیوں میں کیوں جکڑا ہوا ہوں؟ اور جب تجھے نہیں مرنا تو میں کیوں مر جاتا ہوں؟

زندگی کے آخری دور میں ان کی توجہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مرکوز ہو چکی تھی اور علامہ نے دوبارہ اردو میں لکھنا شروع کر دیا۔ ۱۹۳۵ء میں بالِ جبریئل اور ۱۹۳۶ء میں ضربِ کلیم منصۂ شہود پر آئیں۔ علامہ کا کلام نصف صدی کے مطالعے، تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ ہے، اور سیر و سیاحت سے پیدا ہونے والے شعور کا نتیجہ ہے۔ اُس اندرونی علم و ادراک کا ترجمان ہے جو ایک طویل عرصے کے مطالعہ، اپنی تاریخ سے مکمل واقفیت، اور حالاتِ حاضرہ کے سنجیدہ مشاہدے سے آپ کو حاصل ہو چکا تھا۔ آپ کی بعض نظموں میں ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرع ایسا ہے کہ اُس پر مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔

مطبوعات

علامہ کے ۹،۰۰۰ کے قریب فارسی اور ۵،۰۰۰ سے زائد اردو اشعار محفوظ ہیں۔ علامہ نے اپنے تمام مجموعہ ہائے کلام اپنی زندگی میں خود مرتب اور طبع کرائے، سوائے "ارمغانِ حجاز" کے جو آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

اسرارِ خودی	فارسی	۱۹۱۵ء	(اولین مجموعہِ کلام)
			۱۹۲۰ء میں انگریزی ترجمہ بھی لندن سے شائع ہوا
رموزِ بے خودی	فارسی	۱۹۱۸ء	(اسلامی طرزِ زندگی)
پیامِ مشرق	فارسی	۱۹۲۳ء	(گوئٹے کا جواب، روحانیت کی اہمیت)
بانگِ درا	اردو	۱۹۲۴ء	(ابتدائی اردو کلام)
زبورِ عجم	فارسی	۱۹۲۷ء	(سخنے نگفتہ ءراچہ قلندرانہ گفتا)
جاوید نامہ	فارسی	۱۹۳۲ء	(افلاک کی سیر)
بالِ جبریل	اردو	۱۹۳۵ء	(لندن سے براستہ سپین واپسی کے بعد)
پس چہ بائید کرد	فارسی	۱۹۳۶ء	مع نظم مسافر۔ (دورہ افغانستان کے بعد)
ضربِ کلیم	اردو	۱۹۳۶ء	(اعلانِ جنگ، دورِ حاضر کے خلاف)
ارمغانِ حجاز	فارسی	۱۹۳۸ء	(سفرِ حجاز کا تصور، جدید تحریکوں پر تنقید)

خطباتِ مدراس انگریزی ۳۲۔۱۹۲۹ء (۳ خطبے حیدر آباد، بنگلور اور میسور میں،
Reconstruction of ۳ علیگڑھ میں ۱۹۲۹ء میں، اور ایک لندن
religious thought in Islam میں ۱۹۳۲ء میں دیا)

علامہ کی یہ نگارشات ایسا قیمتی سرمایہ ہیں جو پوری قوم کی ملکیت ہے۔ علماء اور محققین بحرِ معانی میں غوطے لگاتے اور مطالب کے موتی سمیٹ کر ہماری جھولی میں ڈالتے جاتے ہیں اور ڈالتے جائیں گے۔

اس دور کے سیاسی حالات

رموزِ بے خودی پہلی جنگِ عظیم کے دوران تصنیف ہوئی۔ اگست ۱۹۱۴ میں چار سالہ جنگ عظیم اول شروع ہوگئی تھی جس میں سلطنتِ عثمانیہ (ترکی) نے جرمنی کا ساتھ دیا اور ۱۹۱۵ میں گیلی پولی کی جنگ میں اتحادی فوج کو شکست دے دی۔ جس کے بعد اتحادی عیسائیوں نے لارنس آف عریبیا کی سازشوں کے ذریعہ عرب علاقوں میں خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کھڑی کروادی اور پھر دو سال بعد ہی ۱۹۱۷ء میں یروشلم میں عیسائی فوجیں داخل کردیں اور آٹھ سو سال بعد بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۱۹۱۹ء میں پیرس امن کانفرنس میں خلافت کا خاتمہ کر کے اسلامی وحدت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ جو خلافتِ عثمانیہ ۱۸۰۰ء میں تین براعظموں پر غالب تھی، ۱۹۱۹ء تک اس کی تقسیم مکمل ہو چکی تھی۔ اس طرح ایک ہی صدی کے اندر اندر دنیا کی عظیم ترین، ۶۲۳ سالہ قدیم سلطنت اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ اندریں حالات ہندوستان میں تحریکِ خلافت شروع ہوگئی اور علامہ اقبال کی توجہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مرکوز ہوگئی۔ ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں نظم "خضرِ راہ" سامنے آئی جو اسی زوال کا نوحہ تھی، اور جس کو انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھتے ہوئے خود علامہ کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ بعد ازاں ۱۹۲۴ء میں اتاترک نے آئینی طور پر خلافت کی حیثیت ختم کردی۔ خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد برطانیہ اور فرانس نے شام۔ لبنان۔ فلسطین اور عراق کو آپس میں تقسیم کرلیا اور لیگ آف نیشنز بنا کر وہاں سے اپنے اقدام کی سندِ جواز حاصل کر لی۔ اسی لیگ آف نیشنز کے قیام پر علامہ اقبال نے کہا تھا بہرِ تقسیمِ قبور،

انجمنے ساختہ اند (یعنی اب انہوں نے قبروں کی تقسیم کے لیے انجمن بنالی ہے)۔ ایران پر بھی برطانوی اثر غالب آ گیا۔ مراکش کو برطانیہ اور فرانس نے آپس میں تقسیم کرلیا۔ الجزائر اور تیونس کو فرانس نے قبضہ میں لے لیا۔ لیبیا اٹلی کے ہاتھ آیا۔ سوڈان برطانوی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ فلسطین، اردن، کویت اور عراق برطانیہ کے حوالے کردئے گئے۔ اسی طرح عدن کی بندرگاہ اور عرب کا مشرقی ساحل بھی برطانیہ کو مل گیا۔ اسلامی سلطنت میں سے صرف خطہء حجاز اور یمن دو ایسے ٹکڑے بچے تھے جو عیسائیوں کے غلبہ سے آزاد تھے۔ اس جنگ کے نتیجہ میں اگرچہ برطانوی اور فرانسیسی استعمار میں توسیع تو ہوگئی لیکن برطانیہ کے ساڑھے سات لاکھ فوجی ہلاک ہوئے، ان کی معیشت اور نفسیات بہت مجروح ہوگئی، برطانیہ کمزور ہوگیا، اور ہندوستان کی آزادی کا امکان روشن تر ہوگیا۔

پنجاب اسمبلی کی رکنیت

۱۹۲۲ء میں انگریزوں نے علامہ اقبال کو سرَ کا خطاب پیش کیا جس سے ان کی شہرت میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں لاہور ہائیکورٹ میں بطور جج تقرری کے لیے علامہ اقبال کا نام تجویز کیا گیا اور اس کی تائید میں بہت آواز بلند ہوئی لیکن ہندو چیف جسٹس سر شادی لال نے آپ کے ملی جذبہ کے پیشِ نظر اس کی مخالفت کی اور آپ جج نہ بن سکے لیکن علامہ اقبال ۱۹۲۶ء میں ۴۹ سال کی عمر میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ اس دوران میں آپ نے کئی بہت اہم قرار دادیں پیش کیں جیسے ضلع منٹگمری میں سوا تین لاکھ ایکڑ رقبہ جو حکومت نے زیادہ تر سرمایہ داروں کو فروخت کیا ہے، اس کا نصف حصہ مزارعین کے لیے مخصوص کر دیا جائے اسی طرح یہ کہ بزرگانِ دین اور انبیا کی توہین کے انسداد کے لیے قانون بنایا جائے اور یہ کہ پنجاب میں انسداد شراب نوشی کے لیے قانون بنایا جائے، تلوار کو قانونِ اسلحہ سے مستثنیٰ کیا جائے وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے رکنیت کا حق کتنی سنجیدگی سے ادا کیا، ورنہ اسمبلیوں کی عمومی کارکردگی کے بارے میں علامہ کا خیال تھا

مجلسِ آئین واصلاحِ رعایات وحقوق

گرمیءِ گفتارِ اعضائے مجالس، الاماں!

نظامِ خلافت

۱۹۲۹ء میں افغانستان میں بچہ سقہ کی بغاوت کے خلاف آپ نے لاہور میں ایک مظاہرہ کروایا تھا۔ظاہر شاہ کا والد نادر شاہ جو بغاوت کے وقت فرانس میں تھا، بچہ سقہ کے خلاف مزاحمت منظّم کرنے کے لیے لاہور آیا تو اس نے علامہ اقبال سے ملاقات کی۔اس ملاقات میں نادر شاہ کے بھائی شاہ ولی خان بھی موجود تھے۔شاہ ولی خان نے وزیرستان میں لشکر منظّم کیا اور بغاوت کے ۹ ماہ بعد ہی بچہ سقہ کو شکست دے کر قتل کر دیا اور کابل پر قبضہ کر لیا۔۱۹۳۳ء میں نادر شاہ نے کابل میں ایک یونیورسٹی کے قیام، نصاب کی تشکیل اور اساتذہ کے انتخاب کیلئے علامہ اقبال کو افغانستان آنے کی دعوت دی، جس پر علامہ اقبال مولانا سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کے ساتھ افغانستان تشریف لے گئے اور یونیورسٹی کے قیام کا تحریری منصوبہ نادر شاہ کو پیش کر دیا۔اس دوران آپ نے سارے ملک کی سیر کی اور "مسافر" کے نام سے فارسی میں سفر نامہ منظوم کیا جو پس چہ بائید کرد میں شامل ہے۔اس میں نظامِ خلافت کے قیام کی خواہش ظاہر کی اور شاہِ افغانستان کو مائل کرنے کی کوشش کی کہ تمہارا سینہ دین کے غم سے صد چاک ہے۔اپنی حکومت اور اپنے زیرِ نگیں ملک میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر فاروق کے نظامِ حکومت کو دوبارہ زندہ کر دے۔افغانستان سے واپسی پر قبائلی علاقوں کا دورہ بھی کیا لیکن کوئی فرد یا جماعت ایسی میسر نہ آئی جو خلافت کے لیے عملی جدوجہد شروع کرتی۔ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم راوی ہیں کہ جنوبی پنجاب کے ایک بزرگ عالم کے پاس ایسے فارم بھی موجود تھے جو علامہ نے تحریکِ خلافت کی رکنیت کے لیے چھپوا لئے تھے۔

تمدّنِ اسلام کے احیاء کا ادارہ

اسلامی علوم کے احیاء اور تعلیمات کی جدید تعبیر کے سلسلے میں اقبال کی تمنا تھی کہ کسی مسلم یونیورسٹی کے اندر یا کسی پرسکون مقام پر ایک بستی کی صورت میں ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں بہترین دل و دماغ کے مسلم نوجوان خالص اسلامی ماحول میں ریاضی، کیمیا، طبیعات، تاریخ، فلسفہ اور دینیات کی تعلیم حاصل کر کے جدید علوم کا قدیم علوم کے ساتھ تعلق دریافت کر سکیں اور جدید مذہبی، سیاسی، اقتصادی، قانونی، علمی، سائنسی اور فنی امور پر مسلمانانِ عالم کی رہنمائی کر سکیں۔ آپ نے اس مقصد کے لیے ایک تحریری منصوبہ بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھجوایا تھا لیکن بوجوہ اقبال کے حسبِ منشا ادارہ آج تک دنیائے اسلام کے کسی ملک میں بھی قائم نہیں ہو سکا۔

خطبات جنوبی ہند

آپ کے سات مشہور خطبات میں آپ کے مذہبی اور سیاسی نظریات واضح نظر آتے ہیں تین لیکچر جنوری ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد، بنگلور اور میسور میں، اور تین خطبات نومبر ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ میں دیے گئے۔ ساتواں خطبہ ۱۹۳۲ء میں ارسطا طالین سوسائٹی کی درخواست پر لندن میں پڑھا گیا۔ ان لیکچرز کے موضوعات یہ تھے:

پہلا خطبہ: " Knowledge and Religious Experience"

"دینیاتِ اسلامیہ اور افکارِ حاضرہ"۔ اس خطبہ میں اقبال نے باطنی تجربات کے حقائق و معارف کو پیش کیا ہے۔

دوسرا خطبہ: "Philosophical Test of the Revelations of Religious Experience" ۔ "مذہبی تجربات کے کشف و الہامات کا فلسفیانہ امتحان"۔ اس میں دینی حقائق و معارف کی فلسفیانہ تعبیر کرتے ہوئے ان کو محکم و موکد کیا ہے۔

تیسرا خطبہ: "The Conception of God and the Meaning of prayer"۔ "ذاتِ الٰہیہ کا تصور، اور حقیقتِ دعا"۔
اس خطبہ میں باطنی تجربے کی مرکزی ہستی یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کی صفات و کمالات اور تصورِ عبادت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

چوتھا خطبہ: "The Human Ego – His Freedom and Immortality"۔ "خودی، جبر و اختیار، اور حیات بعد الموت"۔ یہ خطبہ باطنی تجربے کی حامل ذات یعنی انسانی خودی، اس کی آزادی اور بقا کے موضوع پر مبنی ہے۔

پانچواں خطبہ: "The Spirit of Muslim Culture"

"اسلامی ثقافت کی روح"۔ اس خطبے میں انفرادی خودی کی ہیئتِ اجتماعیہ یعنی تمدن کو اپنی بحث کا موضوع بناتے ہوئے تمدنِ اسلامی کی روح پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے

چھٹا خطبہ: "The Principle of Movement in the structure of Islam"۔ "الاجتہاد فی الاسلام"۔

اسچھٹے خطبے میں علامہ نے تمدنِ اسلامی کے فروغ وارتقا کے لئے، بنیادی عقائد کو چھوڑے بغیر اجتہاد کی ضرورت کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ تمدنی ترقی کی بنیاد صرف مادی ترقی نہیں ہے۔ بلکہ مذہب کی عطا کردہ اخلاقی وروحانی اقدار پر یقین اور عمل ہی تمدن کی حقیقی فلاح کا باعث ہوسکتا ہے۔

ساتواں خطبہ: "Is Religion Possible" "کیا مذہب ممکن ہے"

ساتویں خطبے میں سامعین کے ذہن میں اٹھنے والے امکانی سوال کا جواب فراہم کرتے ہیں کہ آیا اس مادیت زدہ ماحول میں مذہب کوئی حقیقت ہے بھی یا نہیں۔ آپ نے حیاتِ انسانی کی مذہبی زندگی کے تین حصوں کی نشاندہی کی ہے یعنی ایمان، عقل، اور

وجدان، اور ثابت کیا ہے کہ انسان مادیت میں چاہے کتنی ہی ترقی پالے اسے حقیقی تجربے کی لذت ایمان اور وجدان کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اقبال نے ان انگریزی خطبات میں مادیت سے ماورا باطنی حقائق کی نقاب کشائی کی ہے اور واضح کیا ہے کہ گو مادی فتوحات اور تحصیلاتِ علمی کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے تاہم ضروری ہے کہ نظر میں کشادگی پیدا کی جائے اور مادی سطح سے ماوراان حقائق تک بھی رسائی حاصل کی جائے جن کا تعلق ہماری باطنی یا روحانی زندگی کے ساتھ ہے۔ کیونکہ باطنی تجربات بھی اپنی جگہ ایسی ہی ٹھوس حقیقت ہیں جیسی کہ مادی تجربات۔

ان خطبات کا مجموعہ ۱۹۳۴ء میں "Reconstruction of Religous Thought in Islam" کے نام سے لندن سے شائع ہوا۔ یہ عظیم علمی کام ایک مشکل کتاب ہے کیونکہ اس میں مشرق اور مغرب کے ڈیڑھ سو سے زائد قدیم وجدید فلسفیوں، سائنسدانوں، عالموں اور فقیہوں کے اقوال ونظریات کے حوالے دیے گئے ہیں۔ ان خطبات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ برصغیر میں مسلم ریاست کے قیام کا تصور پیش کرنے سے قبل اقبال نے اس کے لیے ایک دینی، تمدنی، معاشرتی یا نظریاتی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی۔ مغرب میں اس کتاب کو "عصرِ حاضر کے اہم ترین مظاہر میں سے ایک" قرار دیا گیا لیکن افسوس یہ ہے کہ خود ہندوستان کے اکثر علماء اور مفکرین ان انگریزی لیکچرز کی تہہ تک پہنچ ہی نہ سکے اور سطحی الزامات سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ان خطبات کا مطالعہ سطحی رہا، بلکہ ان پر بہت کم توجہ دی گئی۔

ہندو مسلم تعلقات

مسلمانوں کے علیحدہ ریاست کے مطالبہ کے جواز کو سمجھنے کے لیے ہمیں مسلم کش فسادات کی تاریخ اور تسلسل کا جائزہ لینا ہوگا:

مسلم کش فسادات

۱۸۰۹ء　بنارس میں پہلا بڑا ہندو مسلم فساد ہوا

۱۸۵۸ء　کے ہنگاموں کے بعد ہندوؤں کی طرف سے سارا ملبہ مسلمانوں پر ڈالنے سے ہندو مسلم اختلافات بڑھتے گئے۔

۱۸۷۱ء　بریلی میں فساد ہوا جس میں بہت سی جانیں ضائع ہوئیں۔

۱۵۸۵ء　یوپی کے بیشتر علاقوں میں اور دہلی میں فسادات رونما ہوئے۔

۱۸۹۳ء　پٹنا بنارس گورکھپور اور بمبئی کے اضلاع فسادات لپیٹ میں آ گئے۔

۱۹۰۵ء　تقسیم بنگال ہونے پر ہندوؤں نے فساد برپا کر دیا۔

۱۹۰۹ء　مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کا اصول منظور ہو جانے پر ہندوؤں نے شدید احتجاج اور فسادات بپا کئے۔

۱۲۔۱۹۱۱ء　مونگھیر، پٹنا، شاہ آباد، آرہ اور کرتارپور کے اضلاع میں فسادات ہوئے۔

۱۹۱۷ء　شاہ آباد میں زوردار جان لیوا فسادات ہوئے۔

۱۹۱۸ء　کرتارپور میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔

۲۲۔۱۹۲۱ء　پنجاب، یوپی، اور سندھ کے صوبے فسادت کی زد میں آ گئے۔

۱۹۲۳ء　کشمیر میں گاؤ کشی کے جرم میں مسلمانوں کو بھاری سزائیں دی جانے لگیں

اور سرکاری ملازمتوں سے نکالا جانے لگا تو ان کی حمایت میں پنجاب اور سرحد کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور مجلس احرار کے زیر اہتمام کافی تعداد میں ریاست میں داخل ہونے لگے، حتیٰ کہ مہاراجہ نے ان کو روکنے کے لئے انگریزی فوج منگوالی۔

۱۹۲۴ء دہلی، ناگپور، لاہور، کوہاٹ، لکھنو، مرادآباد، بھاگلپور، کنکارہ شاہجہانپور اور الہٰ آباد میں فسادات پھوٹ پڑے۔

۱۹۲۵ء دہلی، الہٰ آباد، یوپی کے پورے صوبہ، سی پی، برار، گجرات، بمبئی اور کلکتہ کے مختلف علاقوں میں فسادات ہوئے۔

۱۹۲۶ء پنجاب، بنگال اور یوپی میں فسادات ریکارڈ کئے گئے۔

۱۹۲۸ء بمبئی، کلکتہ اور پنجاب میں فسادات ہوئے۔

۳۲۔۱۹۲۹ء بمبئی، یوپی، بہار اور پنجاب میں فسادات ہوئے۔ کشمیر میں بھی صورت حال خراب ہوگئی۔

۱۹۳۱ کانپور اور کشمیر میں مسلم کش فسادات ہوئے۔

دوقومی نظریہ

ہندوؤں کے مسلم کش رویہ کی وجہ سے ہندو اور مسلمانوں کا دو الگ قومیں ہونا خوب واضح ہو چکا تھا:

۱۰۸۰ء اب سے ۹۰۰ سال پہلے البیرونی نے اپنی تصنیف کتاب الہند میں ہندو مسلم اختلافات کی تفصیل بیان کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہے جو عبور نہیں کی جا سکتی"۔

۱۸۲۸ء سید احمد شہید بریلوی نے سکھوں کے خلاف اعلان جہاد کیا تو بلوچستان اور سرحد کے مسلم اکثریتی علاقوں، پنجاب اور کشمیر کی آزادی کو اپنا منشور بنایا۔ ان کا مقصد شمال مغربی مسلم علاقوں میں اسلامی ریاست کا قیام تھا۔

۱۹۲۳ء کشمیر کے مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کرنے کے لئے ہندو مسلمانوں کی ایک مشترکہ انجمن لاہور میں قائم ہوئی تو علامہ اقبال بھی اس میں شامل ہوئے لیکن جلد ہی ہندوؤں کے رویہ سے مایوس ہو کر الگ ہو گئے۔

۱۹۲۳ء مولانا محمد علی نے پہلی بار اپنی تقریر میں کہا کہ ہندو اور مسلمان مذہب کی بنا پر دو الگ قومیں ہیں۔

۱۹۲۳ء ان حالات میں ۳۰ مارچ کو انجمن اسلام حمایت اسلام کے جلسہ میں اقبال نے اپنی نظم طلوع اسلام پڑھی جس میں مغلوب اور معتوب مسلمانوں کے لئے روشن مستقبل کا پیغام تھا۔

۱۹۲۴ء لالہ لاجپت رائے نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہندو مسلم آبادی کے لحاظ سے

پنجاب اور بنگال کی تقسیم کردی جائے اور مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال کے علاقے مسلمانوں کو دے دیے جائیں اور ہندوستان کے باقی علاقوں میں ہندو حکومتیں قائم کردی جائیں۔ بعد میں متعصب ہندوؤں کے دباؤ سے وہ اپنی بات سے منحرف ہو گئے۔

۱۹۲۴ء　روسی مردِ آہن سٹالن نے کہا کہ ہندوستان بظاہر ایک متحدہ ملک دکھائی دیتا ہے لیکن جب وہاں انقلاب آئے گا تو کئی اجنبی قومیں منصۂ شہود پر آ جائیں گی۔

۱۹۲۴ء　مولٰینا محمد علی نے پھر مسلمانوں کو واضح طور پر ایک علیحدہ قوم قرار دیا۔

۱۹۲۵ء　دست شناس کیرو نے پیش گوئی کی کہ (ہندوستان سے انگریز کو بالآخر نکلنا پڑے گا اور ہندوستان مسلمانوں اور بدھ مت کے پیروؤں میں برابر تقسیم ہو جائے گا)۔

۱۹۲۸ء　'ایک ہندی مسلمان' کے نام سے اخباروں میں مضمون شائع کیا گیا کہ ہندو اور مسلمان دو ایسی ہی الگ قومیں ہیں جیسے جرمن اور فرانسیسی۔ اور چونکہ ان میں اتحاد ممکن ہی نہیں اس لئے ہندوستان کو ان میں تقسیم کر دینا چاہیئے۔

۱۹۲۹ء　اخبار انقلاب میں ایک ایسا سلسلہء مضامین شائع ہوا جس میں شمال مغرب کے مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک مسلم وطن کے قیام کی تجویز پیش کی گئی

۱۹۲۹ء　مسٹر درانی نے اپنی کتاب میں یہ تلخ تجزیہ تحریر کیا کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں اس لئے مسلمان یا تو خودکشی کر لیں یا ہندو بن جائیں یا پھر ہندوستان کی حکومت میں اپنا حصہ طلب کریں۔

۱۹۲۹ء ۳۰ دسمبر کو نواب ذوالفقار علی خان نے خلافت کانفرنس میں کہا کہ مسلمانوں کی شمالی ہند میں دو یا تین صوبوں پر مشتمل علاقہ مدغم کر کے ایک صوبہ بنا دیا جائے اور یہ مسلمانوں کو دے دیا جائے۔ اسی طرح بنگال میں ایسی ہی تقسیم کر دی جائے۔ اب مسلمانوں کو چاہئے کہ حقوق کی بجائے علیحدہ وطن کا مطالبہ کریں

تصورِ پاکستان

علامہ اقبال اپنے مشاہدات اور مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ ہندوستانی مسلمان ہندو اکثریت کے سامنے بے بس ہیں۔ اور ان کی تہذیب وثقافت کی شناخت خود مختار ریاست کے بغیر ناممکن ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو قوم اپنا ملک نہیں رکھتی وہ اپنے مذہب اور تہذیب کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ دین اور کلچر حکومت وشوکت ہی سے زندہ رہتے ہیں اس لئے مسلمانوں کا الگ ملک ہی مسلم تہذیبی واقتصادی مشکلات کا حل ہے۔ ۱۹۰۵ء سے پہلے کی نظم "صدائے درد" میں آپ نے ہندو مسلم کشمکش کا تذکرہ اس طرح کیا ہے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا، یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے

بدلے یک رنگی کے، یہ ناآشنائی ہے غضب ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب جولائی ۱۹۰۸ء کی ایک تحریر میں یہ الفاظ شامل ہیں: "اب میں سوچتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنا اپنا قومی تشخص ایک دوسرے سے الگ برقرار رکھیں۔ مشترک قومیت کا تصور شاعرانہ کشش کے باوجود موجودہ حالات اور دونوں قوموں کے نادانستہ رجحانات کے پیشِ نظر ناقابلِ عمل ہے"۔ ۱۹۲۳ء میں ۱۹ مارچ کو مہاراجہ کشن پرشاد کے نام خط میں علامہ اقبال نے لکھا "افسوس ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلم رقابت بلکہ عداوت بہت ترقی پر ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو آئندہ تیس سال میں دونوں قوموں کے لئے زندگی مشکل ہو جائے گی"۔ ۱۹۲۳ء میں ہی ۱۴ نومبر کو

سعید الدین جعفری کے نام خط میں علامہ نے لکھا" ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے پہلے میں نے دیکھا تھا لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے خیال میں تبدیلی پیدا کر دی ہے"۔ بالآخر ۱۹۳۰ء میں ۲۹ دسمبر کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہء الہ آباد میں " کم از کم شمال مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل خود مختار اسلامی ریاست " کا معرکتہ الآرا تصور پیش کیا جو تحریکِ پاکستان کی خشتِ اول ثابت ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں برطانوی حکومت کی دعوت پر دوسری گول میز کانفرنس لندن میں شرکت کی لیکن وفد کے ارکان کے خیالات میں ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے کسی موضوع پر اظہارِ خیال کرنے کا موقع نہ آیا۔ ہر بار اقلیتی سب کمیٹی کا جس کے علامہ رکن تھے، اجلاس ملتوی ہو جاتا تھا اور انہیں اپنی لکھی ہوئی تقریر پڑھنے کا بھی موقع نہ ملا۔ اقبال بین المذاہب مصالحت کے بغیر مرکزی ذمہ داریوں کے مسئلہ پر بحث کے حق میں نہ تھے۔ دیگر مسلم مندوبین نے ان سے اتفاق کرنے کے باوجود اجلاس میں ایسا اعلان نہیں کیا۔ اس پر مایوس ہو کر اقبال نے وفد سے علیحدگی کا اعلان کر دیا، اور سپین، اٹلی، فرانس اور فلسطین سے ہوتے ہوئے ملک واپس آ گئے۔ خواہش کے باوجود جرمن زبان و فلسفہ کی اپنی ہم عمر استاد اور دوست ایما ویگے ناست سے ملاقات کے لیے جرمنی جانے کا پروگرام نہ بن سکا۔

خطبہء الٰہ آباد اور قرار دادِ پاکستان

غواص تو فطرت نے بنایا ہے مجھے بھی
لیکن مجھے اعماقِ سیاست سے ہے پرہیز

اقبال نے اپنے اس شعر میں عملی سیاست سے عدم دلچسپی کا واضح اظہار کیا ہے، لیکن محض مسلمانانِ ہند کی حالت میں تبدیلی کی خواہش کے پیشِ نظر پنجاب اسمبلی کی رکنیت اختیار کی اور اسی مقصد کی خاطر ۱۹۳۰ء میں ۵۳ سال کی عمر میں مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے، اور ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اپنے صدارتی خطبہء الٰہ آباد میں" کم از کم شمال مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل خودمختار اسلامی ریاست " کا معرکتہ الآرا تصور پیش کیا جو تحریکِ پاکستان کی خشتِ اول ثابت ہوا۔ علامہ نے اس تقریر میں یہ الفاظ استعمال کیے:

"I would like to see the Punjab, North-West Frontier Province, Sindh and Baluchistan amalgamated into a single State. Self-government within the British Empire, or without the British Empire, the formation of a consolidated North-West Indian Muslim State appears to me to be the final destiny of the Muslims, al least of North-West India."

سیاسیات کے عملی میدان میں داخل ہوتے ہی اقبال کے ذہن میں برصغیر کے شمال مغرب میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک مسلم ریاست کا خاکہ واضح طور پر ابھرنے لگا تھا۔ الٰہ آباد کے اس جلسہ کی کاروائی خاموشی سے بغیر کسی گرم جوشی کے شروع ہوئی۔ دنیا کے حالات پر گہری نظر اور خوب غور وفکر کے بعد علامہ نے اپنے صدارتی خطبہ میں مسلم قومیت اور الگ ملک کا نظریہ واضح الفاظ میں پیش کیا جو ماضی، حال اور مستقبل پر اُن کی یکساں گہری نظر کا ثبوت ہے۔ علامہ اقبال کے انگریزی خطبہ کو حاضرین میں سے بمشکل چند ہی لوگ سمجھ سکے، اکثر اکابر بھی باہم گفتگو میں مصروف رہے۔ اقبال نے اپنے خطبہ میں جن امور کا ذکر کیا ان پر زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ خطبے میں پیش کردہ تجویز کی حمائت میں کوئی قرارداد بھی پیش یا منظور نہ ہوئی۔ مقامی اخباروں نے بھی اس خطبہ کی کچھ تفصیل شائع نہ کی اور جب علامہ اقبال الٰہ آباد سے واپس روانہ ہوئے تو سٹیشن پر چند افراد ہی الوداع کہنے آئے۔ البتہ حکومتِ برطانیہ اس خطبہ پر خوب برہم ہوئی۔ ہندو پریس تو گالی گلوچ اور بہتان طرازی پر اتر آیا، اور اقبال کے لیے جنونی، شر انگیز، احمق، خوفناک، زہریلا، تنگ خیال، پست نظر، متعصب، قابلِ نفرت، کمینہ اور نالائق کے الفاظ استعمال کیے۔ "انقلاب" نے البتہ ایک طویل اداریہ لکھا جس کے آخر میں اقبال کے بارے میں لکھا کہ خدا اس مبارک ہستی کو زندہ رکھے جس نے سب سے پہلے راہ گم کردہ، قومیت و جمہوریت کے فریب سے مسحور ملت کے لیے ہدائت کی حقیقی روشنی کا بندوبست کیا۔ "ہمدم" لکھنو نے تجویز کی حمایت میں لکھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند کے قیام کا موقع ملنا چاہیے اور اس کی بہترین شکل یہ ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک مسلم سلطنت قائم کر دی جائے۔ دیگر مسلم سیاسی

رہنماؤں میں سے کسی ایک نے بھی خطبہء الٰہ آباد کے حق میں یا خلاف اپنی زبان نہ کھولی۔ لیکن اس مستقبل شناس کا یہی خطبہ دس سال بعد منظور ہونے والی قراردادِ لاہور (قراردادِ پاکستان) کی وجہ بنا جس کی بنیاد پر بالآخر پاکستان وجود میں آیا۔ اس خطبہ کے دو تین سال بعد ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء میں چوہدری رحمت علی نے لندن سے کتابچہ شائع کیا جس میں لفظ پاکستان پہلی بار استعمال کیا گیا، لیکن مسلم عمائدین یا مسلم لیگ نے اس وقت لفظ پاکستان کو اپنی تحریک میں شامل نہیں کیا۔ (چوہدری رحمت علی نے بعد میں مزید آزاد مسلم ریاستوں کے نام بھی تجویز کیے جیسے بنگ، عثمانستان، صدیقستان، فاروقستان، حیدرستان اور آسام وغیرہ)۔ ۱۹۳۴ء میں حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح جو بقول علامہ اقبال unpurchaseable and incorruptable تھے، مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے ہندوستان واپس تشریف لے آئے، مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کی اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مینارِ پاکستان والی گراؤنڈ میں (جو اس وقت منٹو پارک کہلاتی تھی) قراردادِ لاہور منظور ہوئی۔ اس قرارداد میں بھی لفظ پاکستان شامل نہیں تھا لیکن ہندو پریس نے اسے "قرارداد پاکستان" کہہ کر مسلمانوں کا تمسخر اڑانا شروع کر دیا۔ بالآخر ۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں قائداعظم نے واضح الفاظ میں کہا کہ "ہماری قرارداد میں لفظ پاکستان شامل نہ تھا بلکہ ہندو اور برٹش پریس کے بعض حلقوں نے یہ نام ہمارے سروں پر ٹھونسا ہے۔ اب میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ہمارے مطالبہ کو ایک لفظی نام دے دیا"۔ اس طرح ۱۹۴۳ء میں الگ مسلم ریاست کی تحریک، تحریکِ پاکستان کے نام سے مقبول اور متحرک ہوگئی۔ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا نے ایک منفرد اسلامی ملک پاکستان کا پرچم لہراتا دیکھا اور علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر ظاہر ہوگئی۔

اسلامی ریاست کے خدوخال

اقبال نے نہ صرف برصغیر میں علیحدہ مسلم ریاست کا تصور پیش کیا بلکہ ایک جدید اسلامی فلاحی ریاست کے بنیادی اصول بھی ان کے ذہن میں واضح تھے، جو بقول جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کچھ اس طرح تھے:

۱۔ مسلم قومیت اور وطنیت کی بنیاد مسلمانوں کے ایمان یا عقیدے پر استوار ہے نہ کہ زبان، نسل یا علاقہ پر۔

۲۔ جمہوریت کا نفاذ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع کے لیے ہونا چاہیے۔

۳۔ ریاست قانون کی حاکمیت اور انسانی حقوق کے تحفظ کی ضامن ہو۔

۴۔ پارلیمنٹ صرف شوریٰ ہی نہ ہو بلکہ اسے اسلامی قانون سازی کی خاطر تعبیر اور اجماع کا پورا اختیار ہو۔

۵۔ اجتہاد کا عمل جاری رکھنے کا اختیار صرف پارلیمنٹ کے پاس ہو۔

۶۔ فلاحِ عامہ کے لیے ریاست ہر وہ قدم اٹھانے کی مجاز ہے جسے پارلیمنٹ شریعت کے مطابق قرار دے۔

۷۔ اسلامی قانونِ وراثت، زکواۃ و عشر سختی سے نافذ کیے جائیں۔

۸۔ زمین کی ملکیت کی حد اتنی مقرر کر دی جائے جتنی زمیندار بذاتِ خود زیرِ کاشت لا سکے۔

۹۔ زرعی آمدن پر بھی انکم ٹیکس عام شرح کے مطابق عائد کیا جائے۔

۱۰۔ بے زمین کاشتکاروں کو سرکاری زمین آسان اقساط پر دے دی جائے۔

۱۱۔ مزدوروں کی کم از کم اجرت، طبی اخراجات، رہائش، بچوں کی تعلیم اور پنشن کی قانون سازی کی جائے۔

۱۲۔ پارلیمنٹ تعددِ ازدواج کی حد، اور خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں قانون سازی کرسکتی ہے۔

۱۳۔ مذہبی امور کے شعبے کو ریاست کے دیگر شعبوں سے علیحدہ کیا جانا دین اور سیاست کی علیحدگی نہیں ہے۔

۱۴۔ مخلوط انتخابات کا نظام رائج کیا جاسکتا ہے۔

اس دور کی تحریکیں اور مشاہیر

علامہ کے دور میں دنیا بھر میں جو بھی فکری تحریکیں ابھر چکی یا ابھر رہی تھیں جیسے یورپ میں مادیت، روس میں کمیونزم، جرمنی اور اٹلی کی فاشزم، ایران سے ابھرنے والی بہائیت، ہندوستان میں احمدیت، بے عمل تصوف، تحریکِ خلافت، تحریک آزادیِ کشمیر اور تحریکِ آزادیِ ہندوغیرہ۔ علامہ اقبال کی ان سب پر نظر تھی۔ علامہ نے برگساں کے نظریہِ تخلیقی ارتقا سے اتفاق کے باوجود فرمایا کہ زندگی بے لگام نہیں ہے بلکہ ابدی زندگی کی طرف ایک سفر ہے۔ کارل مارکس کے بارے لکھا

آں کلیمِ بے تجلی، آں مسیحِ بے صلیب

نیست پیغمبر و لے در بغل می دارد کتاب

لیکن فرمایا کہ بحیثیت مسلمان میں انسانی تاریخ کی مادی تعبیر کو درست نہیں سمجھتا۔ گول میز کانفرنس سے واپسی کے دوران اٹلی میں عطیہ فیضی کے اہتمام سے اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی سے بھی (جسے اٹالین ڈوچے کہتے تھے) ملاقات ہوئی۔ ملاقات کے دوران مسولینی نے کوئی اچھوتا مشورہ دینے کو کہا تو فرمایا: ہر شہر کی آبادی مقرر کردو اور اسے حد سے نہ بڑھنے دو۔ مسولینی نے حیرت سے اس کی وجہ پوچھی تو کہا: شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی جاتی ہے اس کی تہذیبی و اقتصادی توانائی کم ہوتی جاتی ہے، اور ثقافتی توانائی کی جگہ شر کے محرکات لے لیتے ہیں۔ اور مدینہ منورہ کی آبادی محدود رکھنے کی رسولِ اکرم کی ہدایت کی مثال دی۔ ملاقات کے بعد مسولینی کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ لوتھر ہے مگر بغیر انجیل کے۔ اُس کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان تیزی ہے جس کو

شعاعِ آفتاب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اٹلی کی ترقی کے بارے میں اپنی نظم مسولینی میں یہ شعر لکھا

فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے؟

وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

۱۹۳۶ء میں احمدیت کی تردید میں انگریزی بیان بعنوان "قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان" متعدد انگریزی اخبارات میں شائع کروایا جس میں لکھا کہ "قبل از اسلام مجوسیت کے جدید احیاء نے جن دو تحریکوں کو جنم دیا ان میں ایک بہائیت ہے اور دوسری قادیانیت۔ ان میں سے بہائیت اس اعتبار سے زیادہ دیانت پر مبنی ہے کہ وہ اسلام سے اعلانیہ علیحدگی کا رستہ اختیار کرتی ہے لیکن قادیانیت اسلام کے بعض ظواہر کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی روح اور نصب العین سے انحراف کرتی ہے۔ بروز، حلول اور ظل کی اصطلاحات مسلم ایران میں اسلام سے منحرف تحریکوں نے اختراع کیں اور مسیح موعود کی اصطلاح بھی مسلم دینی شعور کی تخلیق نہیں ہے۔ ہندوستان کے حاکموں کے لیے بہترین راستہ یہی ہے کہ قادیانیوں کو ایک علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دے دیں"۔

حرکت وحرارت

کلام وفلسفہ از دِل فرو شستم

ضمیرِ خویش کشادم بہ نشترِ تحقیق

اپنے بارے میں اقبال کے اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ وہ تحقیق اور عملی جد و جہد کے مبلّغ تھے اور ہاتھ پیر توڑ کر، محض امید کے سہارے بیٹھ رہنے کے قائل نہ تھے۔ایک خط میں لکھتے ہیں "ہندی مسلمانوں کی بڑی بد بختی ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اُٹھ گیا ہے اور قرآن کی تفسیر میں محاورہ ءعرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معنی لیے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں ہیں. لوگوں نے نہایت بے دردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیے ہیں"۔مروجہ تصوف کے بارے میں اقبال کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:"میں نے شیخِ اکبر محی الدین ابنِ عربی کی فصوص الحِکَم کوئی دس دفعہ بالاستیعاب اور نہائت غور وخوض سے پڑھی ہے۔انکے علم وذوق میں کوئی کلام نہیں، لیکن اس کتاب کے اکثر مندرجات کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں، کم از کم میں انہیں عقائد وتعلیماتِ اسلام سے تطابق نہیں دے سکتا"۔مثنوی اسرارِ خودی میں حافظ کے متعلق اشعار پر چھڑی بحث کے دوران ۱۹۱۶ء کی آپ کی یہ تحریر قابلِ توجہ ہے: "تصوف کے مقاصد سے مجھے کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے؟ کوئی مسلمان ہے جو اُن لوگوں کو برا سمجھے جن کا نصب العین محبتِ رسول اللہ ہے اور جو اس ذریعے سے ذاتِ باری سے تعلق پیدا کر کے اپنے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں؟ اگر میں تمام صوفیا کا مخالف ہوتا تو مثنوی میں ان کی

حکایات و معقولات سے استدلال نہ کرتا"۔ پھر حافظ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " حافظ محض ایک شاعر تھے اور شاعرانہ اعتبار سے میں حافظ کو نہایت بلند پایہ سمجھتا ہوں لیکن انفرادی اور ملی اعتبار سے کسی شاعر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی معیار ہونا چاہیے۔ ان کے کلام سے جو صوفیانہ حقائق اخذ کیے گئے وہ بعد کے لوگوں کا کام ہے، مگر چونکہ اس کو صوفی اور مجذوب سمجھا گیا اس لیے ان کی تنقید ہر دو اعتبار سے ضروری تھی۔ بحیثیت صوفی ان کا نصب العین یہ تھا کہ اپنے آپ میں اور دوسروں میں حالتِ سکر پیدا ہو، لیکن سکر کی حالت اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ آنحضورؐ اور صحابہ کرام کی زندگی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ مومن کی مستقل کیفیت بیداری ہے نہ کہ خواب یا سکر۔ مزید براں جو لوگ سکر کی حالت کو مستقل بنا لیتے ہیں، وہ کشمکشِ حیات کے قابل نہیں رہتے اور قومی و ملی اعتبار سے بھی اس کے نقصان دہ ہونے کی مثالیں اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں"۔ اسرارِ خودی میں پیش کردہ اسی نقطہء نظر کی وضاحت کرتے ہوئے مہاراجہ کشن پرشاد کو تحریر کیا کہ "میں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ اور موجودہ حالات پر بہت غور کیا ہے جس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان کا اصل مرض قوائے حیات کی ناتوانی اور ضعف ہے، اور یہ ضعف زیادہ تر ایک خاص قسم کے لٹریچر کا نتیجہ ہے جو ایشیا کی قوموں کی بدنصیبی سے ان میں پیدا ہو گیا۔ اب حالات اس امر کے متقاضی ہیں کہ اس نقطہء نظر کی اصلاح کی جائے"۔ آپ کا شعر ہے

حلقہء صوفی میں ذِکر، بے نم و بے سوز و ساز
میں بھی رہا تشنہ کام، تو بھی رہا تشنہ کام

علامہ اقبال اپنی قوم میں حرارت اور حرکت کا جذبہ بیدار کرنے کے متمنی تھے۔

اُدھر نہ دیکھ، اِدھر دیکھ اے جوانِ عزیز

بلند زورِ درُوں سے ہوا ہے فوارہ

یا

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں

ہمت ہو پر کشا، تو حقیقت میں کچھ نہیں

فکرِ اقبال

ڈاکٹر سَر محمد اقبال درجہ بدرجہ شہرت و عظمت کی ایسی بلندیوں پر کیسے پہنچ گئے کہ دنیا انھیں ایک عظیم مفکر کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہے۔ انھوں نے ہٹلر اور مسولینی کے نظریات و اعمال پر رائے دی، اقتصادیات اور فلسفہ پر لاثانی مقالے تحریر کئے، غلامی کی تمام قباحتوں کو ابھار کر پیش کیا اور اپنی قوم کے اندر جذبۂ خود اعتمادی اور آزادی کی لگن پیدا کر دی۔ حتیٰ کہ ان کے پیش کردہ تصور نے تاریخِ عالم کی ایک منفرد حقیقت یعنی پاکستان کی شکل اختیار کر لی۔ علامہ کے مزاج میں یہ گہرائی، یہ فکر، یہ علم و ادراک، یہ دانش کیسے جمع ہو گئیں؟ میری دانست میں یہ علامہ کی عمر کے پہلے پندرہ سال ہی تھے جس دوران میں ان کی شخصیت میں عمیق مطالعہ کا ذوق پیدا ہوا اور جس کی بدولت گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے فلسفہ، لندن اور میونخ سے بار ایٹ لاء اور پی ایچ ڈی کے دوران مسلسل سوچ، موازنہ اور تجزیہ ان کی فطرتِ ثانیہ بنا رہا۔ سیاسی حالات کی بدلتی کروٹوں کو دوسروں سے پہلے سمجھ جانے کے قابل ہوئے اور الگ ملک کے قیام کی دور اندیشی پر مبنی لیکن قابلِ عمل تجویز پیش کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس شاہکار کی تخلیق میں بچپن کے دور کی اُس تہذیبِ نفسی کا سب سے زیادہ دخل ہے جس نے سنجیدہ مطالعہ کا ذوق پیدا کیا، جس نے اپنے ماضی کے ساتھ اُن کا تعلق جوڑا، جس نے علومِ شرق و غرب، دونوں کے لئے لگن پیدا کی، اور سب سے بڑھ کر عربی فارسی زبان اور علمِ قرآن کا دخل ہے جو کہ تمام دانش کا منبع ہے۔ ورنہ دنیوی نظریات اور علوم تو ایک مستقل تغیّر پذیری کی کیفیت میں رہتے ہیں۔ بقولِ کسے

علم کیا؟ علم کی حقیقت کیا؟
جیسی جس کے خیال میں آئی

علامہ کی فکر کی تشکیل میں قرآن حکیم کو بنیادی اینٹ کی حیثیت حاصل ہے اور یہ اشعار اس کے شاہد ہیں

گر دلم آئینہء بے جوہر است
ور بہ حرفم غیرِ قرآں مضمر است
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا

(اگر میرا کلام قرآن سے ہٹ کر ہو، تو مجھے قیامت کے دن رسولِ اکرم کی قدم بوسی سے نصیب نہ ہو)

علامہ اقبال کی فکر پر دوسرا بڑا اثر حضورِ اکرم ﷺ کی ذات و کردار کا تھا۔ علامہ کے قلب میں رسولِ اکرمؐ کی احسان مندی کا جذبہ موجزن تھا اور آپ عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ عشقِ رسول میں ڈوبتے چلے گئے جس کا ایک مظہر آخری ایام کا یہ شعر ہے

مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را
حسابِ من زِ چشمِ او نہاں گیر

(یا اللہ! میرا حساب حضور ﷺ کی آنکھ سے بچا کر لینا تا کہ آنجناب کے سامنے مجھے شرمندہ نہ ہونا پڑے)

اس کے بعد بڑا اثر تاریخِ اسلام کے گہرے علم اور شعور کا تھا۔ ملت اسلامیہ کے عروج و زوال کا ایک ایک مرحلہ آپ کے سامنے تھا اور آپ کے دور میں مسلم قوم اور ہندوستانی مسلمان جس نکبت وادبار کی حالت میں تھے اس نے آپ کے حساس دل پر گہری چوٹ لگائی تھی۔ آپ قوم کی بیداری اور نشاۃ ثانیہ کے لیے بیتاب تھے اور غلامی کی تمام خرابیوں کی شکار قوم میں حرکت وحرارت پیدا کرنے کے لیے اسوۂ رسول کو مثال سمجھتے

تھے۔ مشاہیرِ مشرق میں آپ کے افکار ابنِ خلدون اور سر سید کے علاوہ اکبر الٰہ آبادی کی مشرقیت، حضرت مجدد الف ثانی کی غیر تمندی وخودداری کے علاوہ مولانا جلال الدین رومی کے احساسِ ملی اور جذبہ حرکت وحرارت سے متاثر تھے۔ آپ کی کوئی کتاب یا تحریر مولانا روم کے ذکر سے خالی نہیں۔ مولانا روم کی طرح اقبال بھی سیماب پائی کے شیدا ہیں سکون وسکوت کے نہیں۔ علامہ کا مطالعہ اور مشاہدہ مشرقی علوم تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آپ مغرب کے ادب اور علوم وافکار سے بھی کاملاً باخبر تھے۔ شیکسپیئر کے بارے میں لکھا

حُسن آئینہء حق، اور دل آئینہء حسن

دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام، آئینہ

آپ نے مغربی فلاسفہ کی فکر کا بھرپور جائزہ لے کر اس کی خوبیوں کی ستائش لیکن خامیوں پر تنقید کی اور درست فکر واضح طور پر پیش کی۔ آپ کے ہاں مرعوبیت کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ افلاطون کو عہدِ ماضی کی بزدل بھیڑ کہا کیونکہ وہ بالآخر رہبانیت سکھاتا ہے جب کہ قرآن خدا اور کائنات کے ساتھ ہمارے تعلق کو سمجھاتا ہے۔ جرمن مفکر کانت جو عقل کا تعلق محسوسات تک محدود سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ عقل مابعد الطبیعات کو نہیں دیکھ سکتی، اور جس نے حیات بعد الموت کا تصور اس طرح پیش کیا کہ وہاں ایک ایسی برتر ہستی ہوگی جو محروموں کی دادرسی کرے گی۔ اس کے تصورِ حیات بعد الموت کو ناقص قرار دیتے ہوئے علامہ اقبال نے واضح کیا کہ دوسری دنیا کی بنیاد ہمارے ہاں محض اخلاقی قوانین پر نہیں بلکہ ایمان پر ہے۔ یورپ میں بہت مقبول جرمن مفکر نطشے کے نظریہ تکرارِ ابدی کی بجائے مسلسل نئی تخلیق کا نظریہ پیش کیا۔ نطشے کا بے رحم اور بے لگام مردِ برتر ظلم کرنے سے نہیں گھبراتا اور اپنی بقا کی خاطر ہر چیز کو فنا کر دینے کا قائل

ہے جیسے ہٹلر اور مسولینی۔ اس کے برعکس علامہ اقبال نے مردِ مومن اور انسانِ کامل کا تصور اجاگر کیا جو یقینِ محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم جیسی صفات کا حامل ہے۔ قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت کے ساتھ ساتھ عدالت، صداقت اور شجاعت کا مظہر ہے۔ جس کی ادا دلنواز اور نگاہ دلفریب ہے اور رزمِ حق و باطل میں فولاد لیکن حلقہء یاراں میں بریشم کی طرح نرم ہے۔ نطشے کے بارے میں علامہ نے لکھا

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

گوئٹے، جو دیوانِ حافظ کے تراجم سے متاثر اور بے عمل سرور کا مبلغ تھا، اس کے دیوانِ مغرب کے جواب میں پیامِ مشرق لکھی۔ گو اقبال نے برگساں کے تخلیقی ارتقا کے نظریہ سے اتفاق کیا کہ ہاں مسلسل تبدیلی ہی وجود اور حیات ہے تاہم اس کے نظریہِ زماں سے اتفاق کے باوجود اس کے نتیجہ سے کھل کر اختلاف کیا اور کہا کہ انسانی باطن صرف ماضی و حال کے احوال ہی پر مشتمل نہیں بلکہ مستقبل بین بھی ہے۔ علامہ نے فرمایا کہ انسانی باطن جامد نہیں ہے بلکہ ایک مسلسل حرکت ہے، زندگی مقصد کے بغیر بے معنی ہے اور ہر عمل کسی نہ کسی سمت کی طرف ہوتا ہے، اور اسی نظریہ سے حرکت و حرارت اور اخلاقی قوت جنم لیتی ہے۔ علامہ کے ہاں زندگی بے لگام نہیں ہے۔ علامہ کے کئی اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ غریبوں اور پسے ہوئے طبقات کے لیے کارل مارکس کے خیالات علامہ کے خیالات سے بہت ملتے تھے لیکن کارل مارکس نے جس طرح روٹی ہی کو مقصدِ حیات قرار دے دیا علامہ نے اس سے کھل کر اختلاف کیا، انسان کو محض روٹی کا متلاشی حیوان ماننے سے انکار کر دیا، اور فرمایا کہ 'یہ یزداں ناشناس لوگوں کا فلسفہ ہے۔ میں

ایک مسلمان ہوں اور انسانی تاریخ کی اس نوع کی مادی تعبیر کا مخالف ہوں۔ الغرض علامہ اقبال کا ایمان تھا کہ فکر کی جولانیوں کو جو قیادت قرآن اور رسولِ اکرم ﷺ کی تعلیمات مہیا کرتی ہیں، یورپی فلسفی اس سے محروم ہونے کی وجہ سے اچھے بھلے تجزیے کر لینے کے بعد آخری نتیجہ اخذ کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں'۔ علامہ کا ایک شعر ہے

مُردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق

عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

آخری ایام

علامہ اقبال کا بیشتر کلام رات کے آخری خاموش حصے ہی میں مرتب ہوا۔ رات گئے تک جاگتے رہتے۔ پنکھا لگانا پسند نہیں کرتے تھے۔ مسجد میں صرف عیدین کی نماز پڑھنے جاتے۔ مزاجاً گوشہ نشین اور سادہ منش تھے۔ قومی افق پر آپ کی اہمیت کے پیشِ نظر تمام مشاہیر تبادلہء خیالات کے لیے آپ کے پاس تشریف لاتے۔ مئی ۱۹۳۶ء میں قائدِ اعظم اور فروری ۱۹۳۸ء میں نہرو نے بھی جاوید منزل میں آپ سے ملاقات کی۔ مولینا محمد علی جوہر اور مولینا شوکت علی اکثر تشریف لاتے اور قیام فرماتے۔ مولینا محمد علی جوہر تو سر راس مسعود کی طرح آپ کو صرف اقبال کہہ کر مخاطب کرتے۔ لیکن حکومت اور عوام میں برابر مقبولیت اور پذیرائی کے باوجود آپ کی روزمرہ زندگی سادگی کا مرقع تھی۔ علامہ، اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہونے کے علاوہ ایک وجیہہ انسان تھے لیکن آپ کے لباس یا معمولات سے کسی تفاخر کا اظہار نہ ہوتا۔ وہ بظاہر تندرست دکھائی دیتے تھے لیکن تیس پینتیس برس کی عمر سے انہیں دردِ گردہ اور نقرص جیسے عوارض لاحق ہونا شروع ہو گئے اور صحت خراب رہنے لگی۔ آپ کو موتیا بند کا مرض بھی ہو گیا تھا۔ اپریشن کرانا چاہتے تھے لیکن کروایا نہیں۔ علاج کے لیے کچھ عرصہ نواب بھوپال کے ہاں بھی مقیم رہے۔ اس عالم میں جو نظمیں لکھیں وہ ضربِ کلیم میں شامل ہیں۔ آخری دنوں میں قلب، دمے اور گلے کی بیماریاں لاحق ہو چکی تھیں اور آواز خراب ہو گئی تھی۔ اکثر دم کشی کی تکلیف ہو جاتی تو نقاہت کے باعث غشی کا عالم طاری ہو جاتا علالت اور کمزوری کی وجہ سے جاوید منزل کے ایک گوشہ میں چارپائی پر کبھی لیٹے، کبھی تکیوں کے بل بیٹھے حقہ پیا کرتے۔ تنہائی

میں خیالوں میں گم رہنے لگے تھے۔ بعض اوقات اپنا ہی کوئی شعر گنگناتے ہوئے ان کا ہاتھ عجیب تغافل کے عالم میں اٹھتا اور فضا میں گھوم کر اپنی پہلی جگہ پر آ گرتا۔ ساتھ ہی سر کو ہلکی سے جنبش ہو جاتی۔ ایک بار ایسے لگا جیسے وہ مرزا غالب کے ساتھ کسی مسئلہ پر بحث کر رہے ہوں۔ ایک بار اسی انداز میں مولٰینا جلال الدین رومی کے ساتھ محوِ گفتگو پائے گئے۔ ایک دفعہ اونگھ رہے تھے، یکا یک جاگ کر ملازم سے بولے ابھی ابھی مولانا روم اُٹھ کر باہر گئے ہیں اگر چلے نہیں گئے تو انہیں بلا لاؤ میں نے کچھ پوچھنا ہے۔

زندگی کے آخری سالوں میں زیارتِ حرمین شریفین کا ارادہ تھا اور اس سفر سے متعلق اشعار بھی لکھ لیے تھے جو آپ کی وفات کے بعد ارمغانِ حجاز کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، لیکن اس مبارک سفر کا موقعہ نہیں مل سکا۔ انہیں دنوں کا ایک قطعہ ہے

بہ ایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشائید پَر، بہ فکرِ آشیانہ

میں اس بڑھاپے میں عاشقانہ سرور کے ساتھ گاتا جھومتا مدینہ کے لیے روانہ ہوا ہوں
جیسے کوئی صحرائی پرندہ شام کے وقت اپنے پر کھول کر اپنے آشیانہ کو روانہ ہوتا ہے

روایات ہیں کہ آخری عمر میں موجودہ حالات کے مطابق نثر میں فقہء اسلامی مرتب کرنے کا بھی خیال تھا، اس کے لیے مواد اکٹھا کر رہے تھے لیکن موت نے مہلت نہ دی۔ اپنی وفات سے قبل مولٰینا سید ابوالحسن ندوی کے ساتھ نئی مملکت میں نظامِ زکواۃ اور بیت المال کے قیام و انصرام کا بھی ذکر کیا۔ آخرِ عمر علامہ محمد اقبال نبیِ کریمؐ کی محبت میں

بالکل ڈوب گئے تھے اور ایسے رقت آمیز اشعار آپ کے قلم سے نکلے

دلم نالد، چرا نالد ندانم

نگاہے یا رسول اللہ، نگاہے!

(میرا دل روتا رہتا ہے لیکن سمجھ نہیں آتی کہ کیوں؟ یا رسول اللہ، آپ ہی توجہ فرمائیں گے تو اس کو قرار آئیگا)

تو غنی از ہر دو عالم، من فقیر

روزِ محشر عذر ہائے من پذیر

گر حسابم را تو بینی ناگزیر

از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

(یا اللہ تو بے نیاز ہے اور میں تیرے در کا گداگر۔ قیامت کے دن میری معذرت ہی قبول کر لینا۔ لیکن اگر میرا حساب ضرور ہی لینا ہو تو حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے سامنے نہ لینا تاکہ مجھے شرمندگی نہ ہو)

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر

شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر

مکن رسوا حضورِ خواجہ مارا

حسابِ من زِ چشمِ او نہاں گیر

(جب یہ دنیا اپنے انجام کو پہنچ جائے اور سارے راز کھل کر سامنے آجائیں تو میرے اللہ، مجھے حضور ﷺ کے سامنے شرمندگی سے بچالینا اور میرا نامۂ حساب آپ کے سامنے نہ کھولنا)

علامہ کو ایک ہم نوا اور واقفِ راز کی خواہش ہمیشہ رہی۔ ۳۲ سال عمر میں ہی آپ نے یہ اشعار کہے

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے

از رموزِ فطرتِ من محرمے

تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش

بازبینم در دلِ او روئے خویش

سازم از مشتِ گلِ خود پیکرش

ہم صنم او را شوم، ہم آزرش

(اپنے کرم سے مجھے ایک ہم راز ساتھی عطا کر دے جو میری فطرت کو سمجھ سکے تا کہ میں اپنا جذبہ اس کے سپرد کر دوں اُس کے دل میں مجھے اپنا عکس نظر آئے۔اپنی ہی مٹی سے اس کا پیکر تراشوں، اور وہ پیکر میرا پجاری بن جائے)

آخری ایام میں آپ کو ذہنی تنہائی کا احساس ہونے لگا تھا جس کا سراغ پیامِ مشرق کی نظم تنہائی سے یا پھر ارمغانِ حجاز میں شامل ایسے اشعار سے ملتا ہے جیسے

چوں رختِ خویش بر بستم ازیں خاک

ہمہ گفتند، با ما آشنا بُود

ولیکن کس ندانست ایں مسافر

چہ گفت و با کِہ گفت و از کُجا بُود

اب جبکہ میں اس دنیا سے اپنا سامان باندھ چکا ہوں تو سب کہتے ہیں کہ ہمارا آشنا تھا لیکن یہ کوئی نہ سمجھ پایا کہ اس مسافر نے کہا کیا، کسے کہا، اور یہ آیا کہاں سے تھا۔

سفرِ آخرت

تقریباً ۶۱ برس کی عمر میں علامہ ،سَر ،محمد اقبال بار ایٹ لاء نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو دل کے شدید درد سے فجر کی اذان کی گونج میں لاہور میں وفات پائی۔ آپ کے احباب چوہدری محمد حسین، سید نذیر نیازی، سید سلامت اللہ شاہ، حکیم محمد حسن قرشی، راجہ حسن اختر، میاں محمد شفیع اور ڈاکٹر عبدالقیوم شام ہی سے آپ کے پاس تھے۔ طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ شام آٹھ بجے کے قریب یہ شعر پڑھا

نشانِ مردِ مومن باتو گویم

چوں مرگ آید، تبسم برلبِ اوست

(مردِ مومن کی پہچان یہ ہے کہ موت آئے تو اس کے ہونٹوں پر تبسم ہو۔ یعنی مسلمان موت سے نہیں گھبراتا)

پانچ معروف ڈاکٹروں نے مل کر معائنہ کیا اور رائے دی کہ اگر رات خیریت سے گزر گئی تو اگلے روز علاج تبدیل کیا جائے گا۔ گیارہ بجے رات اقبال کو نیند آگئی تو میاں محمد شفیع، ڈاکٹر عبدالقیوم اور راجہ حسن اختر کے علاوہ باقی احباب چلے گئے۔ کچھ دیر بعد شانوں میں شدید درد شروع ہوا تو میاں محمد شفیع اور راجہ حسن اختر باری باری حکیم محمد حسن قرشی کو بلانے ان کے گھر گئے مگر اُن تک رسائی نہ ہو سکی۔ اقبال نے نڈھال ہو کر مایوسی سے کہا کہ افسوس قرشی صاحب نہیں پہنچ سکے۔ اور یہ قطعہ پڑھا

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید ؟

نسیمے از حجاز آید کہ ناید ؟

سرآمد رُوزگارِ ایں فقیرے

دِگر دانائے راز آید کہ ناید؟

(گزرے ہوئے ساز کی آواز دوبارہ شائد آئے یا نہ آئے۔ اب سرزمینِ حجاز سے ٹھنڈی ہوا شائد آئے یا نہ آئے، اِس فقیر کا وقت تو آپہنچا ہے، اب دیکھیں رازوں کو سمجھنے والا کوئی دوسرا آتا ہے یا نہیں)

راجہ حسن اختر پھر حکیم محمد حسن قرشی کو لانے گئے لیکن حکیم صاحب نہ آ سکے۔ صبح کے پانچ بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ اقبال نے اپنے دونوں ہاتھ دل پر رکھ دیے، ان کے منہ سے ہائے نکلا اور فرمایا دل میں شدید درد ہے۔ پھر اللہ کہا اور سر ایک طرف لڑھک گیا۔ مسلم قوم کے ماضی حال اور مستقبل کا شناسا عاشقِ رسول، مردِ مومن، حکیم لامت اور دانائے راز بالآخر اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا۔ انا للّٰہ و انّا الیہِ راجعون ۔احباب کے مشورہ سے اقبال کے جسدِ خاکی کو بادشاہی مسجد کے صدر دروازے کے ساتھ دفن کیا گیا جو ایک بہترین فیصلہ ثابت ہوا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

رحلت کے وقت آپکی اولاد میں بڑے صاحبزادے آفتاب اقبال جوان تھے لیکن چھوٹے صاحبزادے جاوید اقبال اور صاحبزادی منیرہ بیگم کمسن تھے۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب عظیم سپوت ثابت ہوئے، دنیا بھر میں شہرت پائی اور ریٹائر ہو کر گراں مایہ علمی اور قومی خدمات میں ہمہ وقت مشغول ہیں۔ خود علامہ کی سوانح پر نہایت مستند کتاب تحریر فرما کر حوالہء تاریخ کی۔ علامہ کے پوتے اور نواسے بھی خوب نامور ہیں اور علامہ کی فکر کو آگے بڑھانے کے لیے اہم عملی کام کر رہے ہیں۔

حیاتِ اقبال ایک نظر میں

۱۸۷۷ء سیالکوٹ، پنجاب میں پیدا ہوئے

۱۸۹۳ء سکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ سے میٹرک کیا، کریم بی بی سے شادی ہوئی

۱۸۹۳ء سکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں آرٹس میں داخلہ لیا

۱۸۹۴ء داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی اور بذریعہ ڈاک نظموں پر اصلاح لیتے رہے

۱۸۹۵ء بیٹی معراج بیگم پیدا ہوئی جو ۱۹۱۴ء میں وفات پا گئی

۱۸۹۵ء انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا

۱۸۹۷ء سیکنڈ ڈویژن میں بی اے پاس کیا۔ عربی میں فرسٹ آئے۔

۱۸۹۹ء پروفیسر تھامس آرنلڈ کی شاگردی میں ایم اے فلسفہ میں گولڈ میڈل حاصل کیا

۱۸۹۹ء لاہور میں آپ کی اردو شاعری کی شہرت شروع ہوئی

۱۸۹۹ء بڑے صاحبزادے آفتاب اقبال پیدا ہوئے

۱۸۹۹ء اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے استاد مقرر ہوئے

۱۹۰۰ء انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں نظم 'نالۂ یتیم' پڑھ کر شہرت پائی

۱۹۰۱ء بیٹا پیدا ہو کر وفات پا گیا

۱۹۰۱ء کمزور نظر کی بنا پر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی ملازمت کے لیے منتخب نہ ہو سکے

۱۹۰۱ تا ۱۹۰۵ء رسالہ مخزن میں نظمیں شائع ہوتی رہیں۔ ترانۂ ہندی خوب مشہور ہوا

۱۹۰۳ء　گورنمنٹ کالج لاہور میں انگلش لٹریچر اور فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے

۱۹۰۳ء　معیشت کے موضوع پر اپنی پہلی کتاب 'علم الاقتصاد' شائع کی

۱۹۰۵ء　اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ لنکنز ان میں بار ایٹ لاء میں اور ٹرینٹی کالج میں بی اے میں بھی داخلہ لیا۔ ساتھ ہی ساتھ میونخ یونیورسٹی کے لیے پی ایچ ڈی کے مقالہ 'ایران کا فلسفہءالٰہیات' کی تیاری میں مشغول رہے

۱۹۰۷ء　عطیہ فیضی سے ملاقات ہوئی، جو پائیدار قریبی دوستی میں بدل گئی

۱۹۰۷ء　کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج سے بی اے کی ڈگری مل گئی

۱۹۰۷ء　میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی بھی مکمل ہوگئی

۱۹۰۸ء　لنکنز ان سے بار ایٹ لاء مکمل ہوا اور پی ایچ ڈی کا مقالہ لندن سے شائع ہوا

۱۹۰۸ء　آل انڈیا مسلم لیگ کی ایگزیکٹو کمیٹی کی لندن برانچ کے رکن منتخب ہوئے

۱۹۰۸ء　لندن سے لاہور واپس آئے۔ بطور پروفیسر ملازمتوں کی پیشکشیں نظر انداز کر کے بہتر آمدن کے لیے وکالت اختیار کی۔

۱۹۰۹ء　سردار بیگم سے دوسری شادی ہوئی لیکن گمنام خطوط کی بنا پر انہیں چھوڑ دیا

۱۹۰۹ء　مختار بیگم سے تیسری شادی ہوئی

۱۹۰۹ء　وکالت کے علاوہ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر کی عارضی اسامی بھی قبول کر لی۔

۱۹۰۹ء　پہلی بار منشی غلام قادر فرخ کے نام ایک خط میں یہ الفاظ تحریر کیے:

"میری ذاتی رائے جو بھی ہو، ہندو اور مسلمانوں کا متفقہ پالیسی پر رضامند ہونا ممکن نظر نہیں آتا کیونکہ دونوں قوموں کی تہذیب ایک دوسرے سے

بنیادی طور پر مختلف ہے، اور مسلمان کبھی بھی ہندوؤں میں مدغم ہو کر اپنی علحدہ شناخت کھونا نہیں چاہیں گے"

۱۹۱۰ء مسلم بچوں کے لیے ترانہء ملّی تحریر کیا

۱۹۱۱ء انجمن حمائتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں اپنی معرکہ آرا نظم 'شکوہ' سنائی۔ حاضرین نے حسبِ عادت ترنّم سے پڑھنے کا مطالبہ کیا لیکن علامہ نے موضوع کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر تحت اللفظ ہی پڑھی۔

۱۹۱۱ء پروفیسر کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے لیکن بطور ممتحن کام جاری رکھا

۱۹۱۱ء نظم شکوہ پر اس قدر تنقید ہوئی کہ آپکی شہرت پورے ہندوستان پھیل گئی

۱۹۱۲ء قیامِ یورپ کے زمانہ کی آپ کی قریبی دوست عطیہ فیضی کی شادی ہوئی

۱۹۱۳ء موچی دروازہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں نظم 'جوابِ شکوہ' پڑھی

۱۹۱۳ء سردار بیگم کے ساتھ صلح کر کے دوبارہ نکاح کیا، اور مختار بیگم اور وہ ساتھ ہیں۔ ۱۹۱۵ء فارسی مثنوی 'اسرارِ خودی' شائع ہوئی

۱۹۱۶ء پہلی بیگم کریم بی بی نے علحدہ رہائش اختیار کر لی۔ علامہ کفالت کرتے رہے

۱۹۱۸ء دوسری فارسی مثنوی 'رموزِ بے خودی' شائع ہوئی

۱۹۱۹ء انجمنِ حمائتِ اسلام کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے

۱۹۲۰ء کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر رینالڈ نکلسن نے اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ 'The Secrets Of The Self' کے نام سے لندن سے شائع کروایا

۱۹۲۳ء جرمن شاعر گوئٹے کے دیوان 'West-Ostlicher Divan' یعنی

دیوانِ مغرب کے جواب میں لکھی گئی 'پیامِ مشرق' شائع ہوئی

۱۹۲۳ء　برطانوی حکومت کی طرف سے Sir کا خطاب پیش کیا گیا

۱۹۲۴ء　انجمن حمائتِ اسلام کے سیکرٹری کے عہدہ سے مستعفی ہو گئے

۱۹۲۴ء　اردو مجموعہ 'بانگِ درا' شائع ہوا

۱۹۲۴ء　مختار بیگم کا زچگی کے دوران انتقال ہو گیا

۱۹۲۴ء　تیسری زوجہ سردار بیگم کے ہاں جاوید اقبال کی پیدائش ہوئی

۱۹۲۶ء　پنجاب قانون ساز اسمبلی کی لاہور نشست پر رکن منتخب ہوئے

۱۹۲۷ء　فارسی مجموعہ 'زبورِ عجم' شائع ہوا

۱۹۲۹ء　مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر پہلے تین لیکچرز دیے۔ حیدر آباد میں سکول کے بچوں نے آپ کی نظم 'چین و عرب ہمارا' گا کر آپ کا استقبال کیا

۱۹۲۹ء　علی گڑھ میں مزید تین لیکچرز دیے

۱۹۳۰ء　سردار بیگم کے ہاں بیٹی منیرہ پیدا ہوئی

۱۹۳۰ء　آپ کے چھ معرکہ آرا انگریزی لیکچرز 'The reconstruction of religious thought in Islam' کے نام سے لندن میں شائع ہوئے۔ ان عمیق لیکچرز میں آپ نے تفصیلی دلائل کے بعد ثابت کیا کہ ایمان کے بغیر محض مادیت صحیح نتائج تک پہنچنے میں مددگار نہیں ہوتی۔ نیز بنیادی عقائد کو قربان کیے بغیر، عہدِ حاضر کے تناظر میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہتا ہے اور رہے گا۔ (ان خطبات کا دو فقروں میں تعارف کرانا ممکن ہی نہیں ہے)

۱۹۳۰ء　مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے

پہلی مرتبہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر علحدہ مسلم مملکت کا تصور پیش کیا

۱۹۳۱ء　جامعہ ملیّہ دہلی میں نظم مسجدِ قرطبہ پڑھی جو کسی جلسہ میں آپ کی آخری نظم تھی

۱۹۳۱۔۳۲ دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلینڈ تشریف لے گئے اور یورپ بھر کے سفر کیے۔ پیرس میں برگساں سے ملاقات کی، سپین کی سیر کی، روم میں مسولینی سے ملاقات کی، مصر اور فلسطین کا دورہ کیا

۱۹۳۲ء　مسلم لیگ کے صدارتی خطبہ میں قومیت کے یورپی تصور کو مسترد کر دیا

۱۹۳۲ء　فارسی مجموعۂ کلام 'جاوید نامہ' شائع ہوا جو آپ کو سب سے زیادہ پسند تھا

۱۹۳۳ء　شاہِ افغانستان کی دعوت پر یونیورسٹی کے قیام میں رہنمائی اور تعلیمی اصلاحات کے لیے افغانستان کا مختصر دورہ کیا

۱۹۳۴ء　صحت جواب دینا شروع ہوئی اور وکالت ترک کرنا پڑی

۱۹۳۵ء　اردو ماسٹر پیس، 'بالِ جبریل' شائع ہوئی

۱۹۳۵ء　جاوید اقبال اور منیرہ بیگم کی والدہ سردار بیگم کا انتقال ہو گیا

۱۹۳۵ء　ترکِ وکالت اور خراب صحت کی وجہ سے نواب بھوپال نے وظیفہ مقرر کیا

۱۹۳۵۔۳۶ کے دوران کئی دفعہ بھوپال تشریف لے گئے

۱۹۳۶ء　اردو مجموعۂ کلام 'ضربِ کلیم' شائع ہوا

۱۹۳۸ء　لاہور میں رحلت ہوئی اور بادشاہی مسجد کے دروازہ کے ساتھ مدفون ہوئے

۱۹۳۸ء　آخری دور کے اردو اور فارسی کلام پر مشتمل مجموعہ 'ارمغانِ حجاز' (یعنی حجاز کا تحفہ) آپکی وفات کے بعد شائع ہوا۔

علامہ اقبال کا فلسفہء خودی

علامہ اقبال نے انفرادی اور اجتماعی خودی پر بہت زور دیا ہے اور اس موضوع پر بہت سے اشعار کہے ہیں۔ خودی سے مراد خودستائی، خودفریبی یا بر خود غلط ہونا نہیں، بلکہ خود اعتمادی، خودشناسی، خودداری اور اپنی عزتِ نفس کا احساس ہے۔ علامہ چاہتے ہیں کہ مسلم کبھی ان اوصافِ خودی سے عاری نہ ہو اور سوچ، معاملات، مذاکرات، گفتگو، اور طرزِ حیات میں اس کا رویہ ان اوصاف کی نفی نہ کرے۔ مسلمان کاسہء گدائی توڑ دے اور مضبوطی و خودداری اس کی پہچان ہو۔ فکری یا عملی پستی اور جھکاؤ انسان کو بے وقعت کر دیتا ہے۔ اقبال مسلمان کی بے وقعتی سے بہت نالاں تھے اور اس کے سر بلندی کی مسلسل تعلیم دیتے رہے۔ خودی کے موضوع پر علامہ کے کچھ اردو اشعار ذیل میں دیے جا رہے ہیں۔ یہ اشعار مختلف مواقع پر کہے گئے اور مختلف نظموں سے لیے گئے ہیں۔ ان کا توجہ سے مطالعہ کیا جائے تو ممکن ہے کسی شعر کی چنگاری قاری کو بیدار و بیقرار کر جائے۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

تیری زندگی اسی سے، تیری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رُوسیاہی

خودی کی شوخی و تندی میں کِبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی، تو بے لذّتِ نیاز نہیں

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجُو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے، ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

تو رازِ کن فکاں سے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا، نہ میں سمجھا

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی!
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناں گوں

کسے نہیں ہے تمنّائے سروری، لیکن
خودی کی موت ہو جس میں، وہ سروری کیا ہے

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی

زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا

مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا

تجھے گُر فقر و شاہی کا بتاؤں

غریبی میں نگہبانی خودی کی

رائی، زورِ خودی سے پربت!

پربت، ضعفِ خودی سے رائی!

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار

کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

آسماں میں راہ کرتی ہے خودی

صیدِ مہر و ماہ کرتی ہے خودی

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر!

زمانے میں جھوٹا ہے اُس کا نگیں

جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں

خودی را سوز و سازِ دیگرے دِہ

جہاں را انقلابِ دیگرے دِہ

غافل نہ ہو خودی سے، کر اپنی پاسبانی

شاید کسی حرم کا، تو بھی ہے آستانہ!

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض

نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل

اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر

گردشِ دوراں کا ہے جس کی زباں پہ گلہ

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی

ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ!

جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی

آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیء نیام ابھی

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ!

خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ!

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات!

خودی کیا ہے؟ بیداریء کائنات!

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب

وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ!

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو، تیرے شرر میں

جرات ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا
ہیں بحرِ خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے!

نہ دَیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری
کہ خاوراں میں ہے قوموں کی روح تریا کی

خودی کا سّرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ

روح اسلام کی ہے نورِ خودی، نارِ خودی
زندگانی کے لیے نارِ خودی نور و حضور

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا ہے جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

پسند روح و بدن کی ہے وانمود اس کو
کہ ہے نہایتِ مومن خودی کی عریانی

مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس
مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود
خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکتِ صبح و شام سے آگاہ
اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
نہ میں عجمی، نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی
جس بندہ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے برّندہ و برّاق!
خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامہء احرام

اس کی تقدیر میں محرومی و مظلومی ہے
قوم، جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم
کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

خلوت میں خودی ہوتی ہے خود گیر، ولیکن
جلوت نہیں اب دَیر و حرم میں بھی میسّر

خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آبجو سے کیے بحرِ بیکراں پیدا

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود
حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و ثبات

مہر و مہ و مشتری، چند نفس کا فروغ
عشق سے ہے پائیدار تیری خودی کا وجود

نہ خودی ہے، نہ جہانِ سحر و شام کے دور
زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات!

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات
خودی کی موت ہے یہ، اور وہ ضمیر کی موت

مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے!

خودی میں ڈوب، زمانے سے ناامید نہ ہو
کہ اس کا زخم ہے درپردہ اہتمامِ رفو

ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا؟

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی!

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا
ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل وفرات

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟

کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر!

اے کہ غلامی سے ہے روح تری مضمحل
سینہء بے سوز میں ڈھونڈ خودی کا مقام

خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال وجلال
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں!

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی، وہی آخر زمانی

زمین وآسمان و کرسی وعرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

حرفِ آخر

میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال کی شخصیت ،فکر و فلسفہ اور آپکی زندگی کا قومی پہلو اختصار سے واضح کرسکوں۔ ذاتی طور پر میں بیگم عطیہ فیضی کی رائے سے متفق ہوں کہ علامہ جتنا کام کر سکے ان کی علمی اور فکری صلاحیت Potential اس سے کہیں بڑھ کر تھی۔ معاشرتی دباؤ نے بہت بند باندھے لیکن بہر حال اقبال ایک ایسا سیلِ رواں تھا جو اس کے باوجود قومی کشتِ ویراں کو سیراب کر گیا۔

اس احساس کے ساتھ اپنی تحریر کو ختم کرتا ہوں کہ اگر علامہ سر محمد اقبال مرحوم کی سوانح اور تحریروں کی اشاعت اتنی زیادہ ہو جائے کہ عام آدمی کی رسائی بھی فکرِ اقبال تک ہو سکے، تو ان کی تحریریں اب بھی کایا پلٹنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ فارسی کلام کے اقتباسات کا ترجمہ عام کیا جائے اور خطبات کے مفاہیم کو عام فہم زبان میں تعصب سے خوفزدہ ہوئے بغیر عام کیا جائے تو علامہ کا پیغام آج بھی جذبات میں وہ طوفان برپا کر سکتا ہے جو قومی نشاۃِ ثانیہ کا باعث بنے۔ سکول اور کالجز اگر ماہرینِ اقبالیات کے لیکچرز کا باقاعدہ شیڈول بنائیں جو سال بھر جاری رہیں تو تھوڑے ہی عرصہ میں قومی فکر عام ہو سکتی ہے۔

سپردم بہ تو مایہء خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

محمد بشیر ہرل
0300-85544600333-6517766

مرتب

محمد بشیر ہرل
0333-6517766

مضمون نگار و واٹر ٹریٹمنٹ کی معروف کمپنی بی۔ایچ انڈسٹریز کے سربراہ ہیں۔آپ کو سنجیدہ مطالعہ، حج بیت اللہ سمیت ایشیا یورپ اور امریکہ کے بیشتر ممالک کے سفر، اور مختلف مذاہب کے لوگوں سے تبادلہ خیال کے مواقع میسر رہے ہیں۔
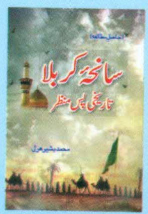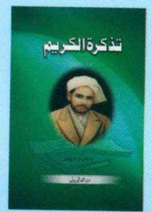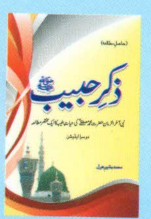
مصنف کی دیگر مختصر تحریریں